دانہ پانی

عمیرہ احمد

الف اللہ چنبے دی بوٹی من وچ مرشد لائی
ہو نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگ ہرجائی ہو

الف سے اللہ کا نام شروع ہوتا ہے۔ میرے مرشد نے میرے دل میں چنبیلی (اللہ کی محبت) کی قلم لگائی ہے (چنبیلی کے پودے کی شکل اسم اللہ سے ملتی ہے) میں نے اس پودے کی نفی اثبات کے پانی سے آبیاری کی (نفی: لاالٰہ اثبات: الااللہ) اور اس کی خوشبو کو اپنے ہر رگ وریشے میں بسالیا۔

گاموماشکی کی بلند آواز ہر روز کی طرح اس صبح جھوک جیون کی فضاؤں میں دور تک کوئل کی کوک کی طرح گونج رہی تھی۔ وہ حق باہو کا کلام پڑھ رہا تھا۔ ہر روز کی طرح فجر کے بعد گاؤں کے کنویں پر چرخی کے ساتھ اپنی مشک باندھ کر کنویں میں ڈالتے ہوئے گاموبڑے جذب سے وہ کلام شروع کر دیتا تھا۔

پیر ملے تے پیڑ نہ جاوے، اوہ پیر کیہہ کرنا ہو
جس مرشد تھیں اشد نہ ہووے اوہ مرشد کہہ کرنا ہو۔

(پیر ملے اور درد نہ جائے۔ ایسے پیر کو مت مانو جس مرشد سے رشد نہ ملے، اس مرشد کو کیا کرنا؟)

کنویں کی چرخی گرگر کر کے گھومتی جارہی تھی اور اس کی لپٹی رسی مشک کے وزن سے کھلتی جارہی تھی اور گامو چرخی کو اور تیزی سے گھماتا حضرت سلطان باہو کا کلام بڑے جذب سے پڑھتا ہوا کسی اور جہاں میں پہنچا ہوا تھا۔ اسے نہ قرآن آتا تھا نہ حدیث۔ بس آتا تھا تو حق باہو کا کلام جو اُس نے اپنے باپ کو سن سن کر رٹا تھا۔ بچپن میں کبھی ماں باپ نے قرآن باقاعدہ پڑھایا تھا اور پہلے سپارے سے پہلے ہی باپ کی موت نے غلام محمد کے ہاتھ میں سپارے کی جگہ پانی کی مشک پکڑادی جو اُس کے قد سے بھی بڑی تھی۔ اور وہ غلام محمد سے گاموماشکی ہوگیا اور یہ کام اُس نے بڑی خوشی خوشی سنبھالا تھا۔

وہ جدی پشتی ماشکی تھا۔ باپ دادا بھی یہی کام کرتے تھے اور اُسے بھی باپ کے ساتھ بچپن سے ہی گاؤں کے کنویں پر جا کر چرخی کھمانا اور مشک بھرنا اچھا لگتا تھا پر اُس سے بھی زیادہ مزے کا کام اُس پانی کی مشک سے پورے گاؤں کے گھروں کے مٹکے اور برتن بھرنا تھا اور پھر گلیوں کی سوکھی مٹی پر پانی کا چھڑکاؤ اور سوکھی مٹی کا یوں نم ہو کر بیٹھنا جیسے وہ اُس پانی کے لیے ترسی ہوئی تھی۔ گامو تین سال کی عمر سے باپ کے ساتھ ساتھ صبح سویرے اپنے ننھے قدموں سے کسی بڑے کی طرح چلتے ہوئے جھوک جیون کے اُن

پچاس ساٹھ گھروں کے دروازے جاتا تھا، اُس کا باپ پانی کا چھڑکاؤ کر کے حق باہو پڑھتا جاتا اور وہ کلام ننھے غلام محمد کے ذہن پر جیسے نقش ہوتا گیا تھا۔ اُس کے باپ کی کوک میں ہوک نہیں تھی پر گاموکی آواز میں ہوک ہی ہوک تھی۔

جس ہادی تھیں نہیں ہدایت اور وہ ہادی کیہہ کرنا ہو
مرشد عین حیاتی باہو، لوں لوں وچ سمایا ہو

(جس ہادی سے ہدایت نہ ملے، اس ہادی کے پیچھے چلنے سے کیا فائدہ؟ مرشد تو وہ ہے جو عین حیات ہو، نس نس میں سمایا ہو۔)

مشک کنویں کی تہہ میں پانی سے ٹکرائی تھی اور چرخی گھومنا رک گئی۔ اتنے اندھیرے میں بھی گاموکو پتا چل گیا تھا کہ مشک پانی تک پہنچ گئی اور اب پانی میں ڈوبتے ہوئے وہ اُس پانی کو اپنے اندر سمو رہی تھی گامو کنویں کے کنارے کھڑا بغیر دیکھے بھی جیسے سب دیکھ رہا تھا۔ کتنی دیر میں مشک پانی تک پہنچتی، کتنی دیر میں پانی سے بھر جاتی اور پھر کب واپس کھینچ لینی تھی۔ چرخی کے گرد لپٹی باقی ماندہ رسی یک دم کھل کر تن گئی تھی۔ گامو کو پتا تھا اب اُسے مشک واپس کھینچ لینی تھی۔

کیتی جان حوالے رب دے، ایسا عشق کما ہو
مرن تھیں پہلے مر گئے باہو، تاں مطلب نوں پایا ہو

ہم نے ایسا عشق کمایا ہے کہ اپنی جان صرف رب کے حوالے کر دی ہے مرنے سے پہلے جان جان آفرین کے سپرد کر دی ہے تب جا کر مر پائی ہے۔

یو پھٹ رہی تھی جب گاموں مشک کھینچ رہا تھا اور چرخی اُسی گرگر کر کی آواز کے ساتھ اب الٹا گھومتے ہوئے رسی کو لپیٹ رہی تھی، جب تک مشک کنویں سے باہر آئی، گاؤں کے چند آوارہ کتے ہر روز کی طرح پیاس سے پانپتے کانپتے زبانیں لٹکائے کنویں کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ وہ گامو پر کبھی نہیں بھونکتے تھے کیونکہ صبح شام وہی تھا جو مشک کنویں سے نکال کر سب سے پہلے کنویں کے پاس بنے اک گڑھے میں ان کے لیے پانی ڈالتا تھا۔ وہ کتے گامو سے بھی پہلے اُس گڑھے کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ مشک سے نکلتا ٹھنڈا پانی اُس گڑھے میں گرنے لگا اور تب تک گرتا گیا جب تک آخری کتا بھی اپنی پیاس بجھا کر ہٹ نہیں گیا تھا۔

جاں دو مرشد کا سئہ دتڑا ، تاں دی بے پرواہی
ہو راتیں جاگیاں کیہہ ہویا جے، مرشد جاگ نہ لائی

(دل وروح کے ان ٹکڑوں کا کفن پہن کر میں بغداد کے فقیروں میں مل جاؤں گا بغداد کی گلیوں میں بھیک مانگتا پھروں گا اور محبوب کا نام بار بار پکاروں گا۔)

جھوک جیون کی صبح شام گاموماشکی کے پانی اور حق باہو کے کلام سے ہوتی تھی نہ مشک کا پانی ختم ہوتا تھا نہ گامو کی آواز کا

سوز۔۔۔نہ اُس کی ہوک۔جو بھی گاموکو سنتا تھا بس سنتا ہی رہ جاتا تھا۔وہ اُس گاؤں کا Pied Piper تھا جو صبح سویرے پانی بھرتا، چھڑکاؤ کرتا، پیاس بجھاتا پورے گاؤں کے چرند پرند کو اپنے پیچھے لگائے پھرتا رہتا تھا۔گاؤں کا پتا پتا بوٹا بوٹا جیسے گاموکی آواز ،اس کے پیروں کی چاپ، اُس کی مشک سے چھلکتے پانی کی مہک اور مٹھاس کو پہچانتا تھا۔وہ کتے کنوئیں پر گاموکی مشک سے پانی پیتے پھر گاموکے ساتھ ساتھ پورے گاؤں میں تب تک گھومتے پھرتے تب تک گاموشک پھر بھر کر گاؤں کی گلیوں میں پھرتا رہتا اور پھر جب وہ اپنے گھر چلا جاتا تو وہ بھی لوٹ جاتے اور پھر شام کو پھر کنویں پر گاموکے انتظار میں بیٹھے ملتے۔

گاموراستے میں آنے والی ہر مخلوق کو پانی پلانے کھڑا ہو جاتا تھا۔اور کئی بار گاؤں کی عورتوں کی جھڑکیاں سنتا جن کے گھر وہ اس لیے دیر پہنچتا تھا کیونکہ اُس کی مشک بار بار بھر کے خالی ہو جاتی تھی پر گاموکے ماتھے پر کبھی بل آیا نہ اُس کے ہونٹوں سے کبھی ہنسی جدا ہوئی۔

چھوٹے قد کا دبلا پتلا، سانولا سا، معمولی صورت کا گاموپانی ڈھوڈھو کر اُس گاؤں کے لوگوں کا رازدان بن گیا تھا جس سے پانی بھرواتے، پیتے کوئی بھی کچھ بھی پوچھ لیتا۔کچھ بھی کہہ دیتا۔دل کے رازوں سے لے کر ذہن کے پردوں پر بننے والی یادوں تک ۔

گاموماشکی سے کسی کا کوئی پردہ نہیں تھا۔دل سے کسی کا کیا پردہ۔وہ جھوک جیون کی رگوں میں پانی خون کی طرح پہنچاتا جھوک جیون کا دل ہی تو تھا۔

کنویں سے مشک اٹھا کر وہ سب سے پہلے گاؤں کے قبرستان میں قبریں تر کرنے جاتا تھا۔یہ بھی اُس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کی قبروں پر پانی چھڑکاؤ کرتے گاموساری ہی قبروں کو تر کرنے لگتا تھا کیونکہ گیلی قبروں کے درمیان سوکھی قبریں گاموکا منہ چڑائی تھیں جیسے اُس نے سب کو پانی پلا دیا ہو اور کسی ایک کو چھوڑ دیا ہو اور گاموکہاں کسی کو چھوڑنے والا تھا۔وہ جن کے خاندان والوں کی قبریں تھیں۔وہ وہاں آتے نہ آتے ،گاموضرور آتا، قبریں ٹھنڈی کرتے کرتے ، پورے قبرستان میں پانی چھڑک کر چلا جاتا اور جہاں جہاں کسی نے قبر پر پرندوں کے لیے دانہ پانی کے پیالے رکھ ہوئے تھے ان میں بھی پانی بھر جاتا۔

وہ قبرستان کے بعد سیدھا گاؤں کی مسجد جاتا وہاں گھڑے بھرتا اور خوشی سے نہال ہوتا رہتا یوں جیسے وہ رب سوہنے کے گھر میں پانی دینے آیا ہو گاؤں کی اُس کچی مسجد میں کوئی نمازی آتا نہ آتا، گاموپانی ڈالنے ضرور آتا۔قبرستان میں لگے موتیا کے پودوں سے پھول توڑ کر وہ مسجد میں پانی کے گھڑوں کے پاس چھوڑ جاتا کسی اور نے مسجد میں جھاڑو نہ دی ہوتی تو وہ جھاڑو دینے کھڑا ہو جاتا۔

اور مسجد کے بعد وہ سب سے پہلے گاؤں کے چوہدریوں کی حویلی جاتا تھا۔

بغدادی کی اے نشانی داچیاں، عیاں، چیراں ہو

تن من میرا پرزے پرزے، جیویں درزی دیا لیراں ہو

(بغداد شہر کی کیا نشانی ہے؟ فقر کی واہ میں لگے گہرے زخم اسی راہ میں میرا تن من یوں سیر و سیر ہو چکا ہے، جیسے درزی کے کٹے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑے)

اُس حویلی سے گاموکو دانے آتے تھے۔وہ دانے جس سے اُس کے گھر کا چولہا جلتا تھا اور اُس کے پیٹ کا ایندھن بھی۔وہ احسان مندی اور تشکر کے لیے وہاں پانی ہی لا سکتا تھا۔اس کے باوجود کہ حویلی میں ہینڈ پمپ بھی لگا تھا اور وہاں پچھلے احاطے میں اپنا کنواں بھی تھا۔اُسے کبھی کسی نے حویلی پانی لانے کے لیے نہیں کہا تھا پر گاموپھر بھی وہاں جاتا اور حویلی میں وہیں سے پانی لے لے کر اندر باہر چھڑکاؤ کرتا اور حق باہو کا کلام پڑھتا جاتا۔کئی بار چوہدری کرامت اُسے بٹھا کر وہ کلام سنانے کا کہہ دیتے اور جس دن وہ چوہدری کرامت کو کلام سناتا، اُس دن صبح سویرے ہی جیسے اُس کا دامن دانوں سے بھر جاتا۔وہ گاموکو کچھ نہ کچھ دے کر ہی رخصت کرتے۔گاؤں کے ماشکی کے لیے کبھی حویلی کا دروازہ بند نہیں ہوا تھا۔یہ جیسے اُس کے کام اور ''عہدے'' کی تکریم تھی۔

لیراں دی گل کفنی پا کے، رل ساں سنگ فقیراں ہو

مشک بغداد دے ٹکڑے باہو، کر ساں میراں میراں ہو

اندر کسی کمرے میں چوہدری کرامت مردان خانے میں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے، گاموکے کلام نے جیسے چوہدری کرامت کے دل پر ہاتھ ڈالا تھا چوہدرائن کو چار مہینے ہوئے تھے فوت ہوئے اور جب سے وہ گئی تھی چوہدری کرامت کا اندر باہر ہی بدل کے رہ گیا تھا۔گاموکی آواز ان کو اندر باہر سے یوں ''پھر دل'' رہی تھی جیسے دانوں کو صاف کرنے کے لیے ان میں ہاتھ پھیرتی کسی کی انگلیاں۔

چوہدری کرامت نے آئینے کے سامنے کھڑے اپنی آنکھوں کو رگڑ کر خشک کیا تھا اور پھر کلاہ سر پر جماتے ہوئے انہوں نے اپنے ملازم کو آواز دی تھی۔

''گاموکو چھاچھ کی گھڑولی دینا آج دانوں کے ساتھ۔''

ان کا ملازم تابعداری سے باہر لپکا۔

☆☆☆

چوہدری کرامت کی حویلی میں کئی دن سے سفیدی ہو رہی تھی۔ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی کی تیاری تھی جو چوہدرائن کی زندگی میں شروع ہوئی تھی۔اور اب اُس کے جانے کے کئی مہینے بعد دوبارہ شروع ہوئی تھی

ایہہ تن میرا چشمہ ہووے مرشید دیکھ نہ جاں ہو
مرشد دادیدار ہے باہو، لکھ کروڑا جاں ہو

☆☆☆

گاموکی بیوی اللہ وسائی نے برتن میں پڑے دانوں کی آخری مٹھی کو چکی کے پاٹ میں ڈالا تھا وہ اس وقت گھر کے صحن میں بیٹھی آٹا پیس رہی تھی۔ بس وہ آٹا آج ہی کے لیے کافی ہوتا کہ پس کر دو وقت کی روٹی مل جاتی پھر کل کیا ہوتا، وہ کبھی اللہ وسائی نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ صبح اٹھ کر ایک مٹھی بھر کر دانے اسی برتن سے گھر کے صحن میں آنے والے پرندوں کے لیے نکال لیتی اور کچھ مٹھی دانے آٹا پیسنے کے لیے وہ برتن چھوٹا تھا اور اُس میں دانے چوہدریوں کے گھر سے ہی آتے تھے، ہمیشہ فصل کٹنے کے وقت زیادہ آتے اور کئی مہینے چلتے اور جب وہ ختم ہونے لگتے تب بھی کسی نہ کسی خدمت کے عوض چوہدریوں کے گھر سے کچھ نہ کچھ آتا ہی رہتا۔

اللہ وسائی ہر بار آخری مٹھی دانے نکالتے ہوئے سوچتی کہ اتنی بڑی دنیا کے لکھ کروڑوں لوگوں میں رب سوہنے کو گاموا ور اُس کی بیوی کا وہ خالی ہوتا برتن بھی نظر آتا اور یاد ہوتا ہے۔ واہ رب سوہنے تیری شاناں۔

وہ سوچتی اور ہر بار اُس برتن کے دوبارہ بھرنے پر رب سوہنے پر قربان جاتی۔ برتن کا خالی ہو کر دوبارہ بھر جانا اللہ وسائی کے لیے معجزہ تھا، اُسے رب سوہنے کی ذات سے کوئی اور معجزہ نہیں چاہیے تھا۔ پتھر کے دو پاٹوں والی چکی کی ہتھی اللہ وسائی کے ہاتھوں میں گھومتی جا رہی تھی۔ اور پسا ہوا آٹا نیچے پھیلائے کپڑے پر گرتا جا رہا تھا۔ اللہ وسائی کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ جیسے سانس لینے کے لیے رکی ۔ دوپٹے کے پلو سے اُس نے اپنے ماتھے کا پسینہ صاف کیا۔ مئی جون میں چکی چلاتے وہ سر سے پیر تک اسی طرح پسینے میں نہا جاتی تھی۔

دوبارہ چکی چلانا شروع کرنے سے پہلے اُس نے جیسے کان لگا کر فضا میں گاموکی آواز کی بازگشت کو کھوجنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی آواز پورے گاؤں میں گونجتے گونجتے اُس کے اپنے گھر میں اللہ وسائی کے کانوں تک بھی ضرور پہنچتی تھی اور اُس کی آواز کی اونچ نیچ سے اللہ وسائی جیسے حساب لگا لیتی تھی کہ وہ اس وقت گاؤں کی کس گلی میں تھا۔ اور کب تک گھر پہنچ جائے گا۔

وہ فجر کے وقت اٹھتی اور پھر گھر میں گاموکی قریب دور ہوتی آواز کی گونج سنتے وہ گھر کے کام نپٹاتی اُس کی آواز جیسے الہ وسائی کے لیے گھڑی کا کام دیتی تھی۔ وہ چھوٹا سا گاؤں تھا بڑا ہوتا تب بھی اللہ وسائی کو یقین تھا، گاموکی آواز پھر بھی اتنی بلند ضرور ہوتی کہ اُس کے گھر تک پہنچتی رہتی۔

گاموگلیاں گلیاں پھرتا۔ اللہ وسائی گھر کے کام نپٹاتی۔ اُس کے لیے آٹا پیستی اور اس کے آنے سے پہلے ناشتہ تیار کیے بیٹھی ہوتی۔ گندم کی روٹی اور اچار۔ کبھی اچار اور رات کا بچا ہوا سالن اور کبھی خالی روٹی، گاموکی کمائی پانی کی کمائی تھی اور پانی کی کمائی

ہوائی روزی۔

پر اللہ وسائی کو کبھی فرق نہیں پڑا تھا کہ گاموکیا کماتا تھا اور کیا لاتا تھا۔ اُس کے لیے بس گاموکافی تھا باقی چیزیں ہوتیں نہ ہوتیں ،آتیں نہ آتیں۔

جتنا سیدھا گاموتھا، ویسی ہی اللہ میاں کی گائے اللہ وسائی تھی۔ گاؤں کے ہر گھر میں، ہر کام کے لیے آگے آگے۔ خوشی غمی میں بغیر بلائے جانے والی۔ کسی کی بیٹی کی شادی ہوتی تو اللہ وسائی باورچی خانہ اور برتن سنبھال لیتی۔ داج سینے پرونے میں تو وہ پہلے ہی آگے ہوتی تھی پر جب تک شادی چلتی رہتی، اللہ وسائی راکھ سے برتن مانجھ مانجھ کر اپنے ہاتھ زخمی کر لیتی پھر بھی اُس کو درد نہیں ہوتا تھا۔

لڑکی رخصت ہوتی۔ اللہ وسائی گاؤں کی آخری سڑک تک گھر والوں کے ساتھ روتی دھوتی جاتی۔ لڑکی کی ماں بہنوں کو تسلی دیتے دیتے خود رو رو کر ہلکان ہو جاتی اور اپنے دوپٹے کے پلو سے ناک، آنکھیں رگڑ رگڑ کر اپنا حشر کر لیتی اور اگر کہیں لڑکے کی شادی ہوتی تو اللہ وسائی ایسی ڈھولک بجاتی کہ پورا گاؤں ناچ اٹھتا اُس کے ہاتھ سرخ ہو جاتے، بازو اور کندھے دکھنے لگتے، بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سن ہونے لگتیں مگر مجال ہے کہ اللہ وسائی محفل چھوڑ کر جاتی ہے اُسے سارے سہرے سارے ٹپے یاد تھے۔ اپنی توتلی زبان میں وہ سہرا شروع کرتی اور پورے گاؤں کی عورتیں اُس کی ہم آواز ہو کر گانے لگتیں اور اُن کے گانے اور آوازوں میں اللہ وسائی کی توتلی آواز چھپ جاتی اور اللہ وسائی ڈھولک پیٹتے سہرا گائے جاتی۔ ڈھولک کی دو ڑیاں کستی بار بار نئے سرے سے نئی لے پر ڈھولک پیٹتی۔ وہ گاموماشکی کی بیوی نہ مشہور ہوتی تو پھر ڈھولک والی مشہور ہوتی تھی۔

گاؤں میں کسی کے گھر سوگ ہو جاتا تو بھی اللہ وسائی سب سے پہلے پہنچنے والوں میں ہوتی تھی باورچی خانہ سنبھال کر بیٹھ جاتی تھی۔ غم سے بے حال اہل خانہ کو اللہ وسائی کے ہوتے ہوئے یہ نہیں سوچنا پڑتا تھا کہ دوسرے گاؤں سے آنے والے شریکے کو کسی نے کھانا کھلا کر بھیجا یا نہیں اور کھانا آیا کہاں سے۔ اللہ وسائی اور گاموماشکی جہاں سے بھی بندوبست کرتے، سوگ والے گھر کا چولہا ٹھنڈا نہ پڑنے دیتے۔ اللہ وسائی ہر میت پر یوں بلک بلک کر روتی جیسے وہ اسی کا رشتہ دار تھا۔ حالانکہ اللہ وسائی نے کسی اپنے کی موت کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ اُس کے ماں باپ اُس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی طاعون کا شکار ہو کر مر گئے تھے۔ دادا، نانا نانی پہلے ہی نہیں تھے۔ رشتے کے جس چچا نے اُسے پال پوس کر شادی کی تھی، وہ ابھی بھی حیات تھے اور ان کے اہل خانہ بھی مگر اللہ وسائی پھر بھی ہر موت پر اپنے رشتہ داروں کے نام لے لے کر یوں روتی تھی جیسے اُس کا غم تازہ ہو گیا ہو۔

گاؤں والے ہر خوشی غمی میں اللہ وسائی کو پکارتے پھرتے تھے لیکن اگر کبھی نہیں پکارتے تھے تو تب نہیں پکارتے تھے جب کسی کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا۔ پھر کسی کے گھر سے اللہ وسائی کے لیے بینوتا نہیں آتا تھا۔ وہ بے اولاد تھی، نیک تھی تو کیا ہوا، تھی تو بے اولاد

اور بے اولاد عورت کی پرچھائیں ایسے گھر میں نہیں پڑنا چاہیے تھی۔

وہ سب اللہ وسائی کو جانتے تھے۔ جانتے تھے کہ وہ نہ حسد کرتی ہے نہ اسے کسی سے جلن ہے پھر بھی لوگوں کو اندیشہ ہوتا کہ اُس کی نظر نہ لگ جائے۔ اللہ وسائی دس سال سے بے اولاد تھی اور اُس نے جیسے اس بے اولادی کو بھی اللہ رضا سمجھ کر سر جھکا دیا تھا پر دنیا کو اللہ کی رضا سے سروکار نہیں ہوتا نہ اللہ کے حکم سے۔ دنیا اپنے وہموں اور رواجوں پر چلتی ہے اور اللہ وسائی کو کسی سے اس بات پر بھی گلہ نہیں ہوتا تھا۔

وہ خاموشی سے آس پڑوس میں بچے کی پیدائش پر آ کر رقص کرنے والے ہیجڑوں کی آوازیں اور گانے سنتی جو گڑوی بجا بجا کر ناچتے، دعائیں دیتے۔ نومولود کی بلائیں لیتے اور اللہ وسائی اپنے گھر کے اندر چوکھٹ سے کان لگائے باہر کے اس شور وغل کو سن سن کر خوش ہوتی رہتی۔

اپنی توتلی زبان میں وہ بھی ہیجڑوں کے ساتھ آواز ملاتی، نئے پیدا ہونے والے بچے کو بغیر دیکھے، بغیر چھوئے لوریاں دیتی رہتی اور گامو اگر گھر پر ہوتا تو دل مسوس کر رہ جاتا، صحن میں بیٹھے وہ حقہ پیتے کبھی اُس کو دیکھ کر ہنستا، کبھی روتا اللہ وسائی کے قہقہوں میں اُس کی آنکھوں کی برسات دیکھتا جاتا اور پھر حق باہو کا کلام پڑھنے لگتا۔ وہ کلام جیسے اُس کے سارے زخموں پر مرہم کا کام کرتا تھا۔ وہ رب کی شان بیان کرتا جیسے رب کی محفل میں پہنچا ہوتا اور ہر بار اس کیفیت میں آنے کے بعد وہ جیسے توبہ توبہ کرتا۔ کہاں رب، کہاں گامو ماشکی۔۔۔۔

اُس کی کیا اوقات کہ وہ رب سوہنے کے دربار میں ہونے کا سوچے بھی۔

وہ با آواز بلند اپنے آپ کوستا۔ اور اللہ وسائی اُسے کسی مرید کی طرح دیکھتی جاتی۔

اللہ وسائی کو گامو کے اُس کلام کی لکھ سمجھ نہیں تھی جس کو سننے کے لیے لوگ رک جاتے تھے۔ وہ بھی گامو کی طرح چٹی ان پڑھ تھی اور اُسے اگر کچھ یاد تھا تو شادی بیاہ کے سہرے اور ٹپے اور بس۔ پر گامو کو حق باہو کا کلام پڑھتے سن کر اس پر بھی جیسے وجد طاری ہو جاتا تھا اور وہ زار زار روتی تھی۔

وہ کلام کیا کہتا تھا، یہ اُسے نہیں پتا تھا مگر اُسے یہ پتا تھا کہ وہ حق تھا۔ بزرگوں کی باتیں تھیں۔ نیکوں اور ولیوں کی اور اُس میں رب سوہنے کا نام آتا تھا۔ بار بار آتا تھا اور جب بھی گامو کلام پڑھتے ہوئے اللہ کا نام لیتا۔ دوپٹہ اوڑھے اللہ وسائی کچھ بھی کر رہی ہوتی، وہ سینے پر ہاتھ لگاتی جیسے رب کو دل میں اتار رہی ہو۔ اُس نے کبھی گامو کا کلام پڑھنے کی جرأت نہیں کی تھی، وہ تتلاتی تھی اور اُسے لگتا تھا وہ اُس کلام کو تتلا کے پڑھے گی تو بے ادبی کرے گی اور یہ کوئی ٹپہ اور سہرا تو ہے نہیں کہ کچھ بھی کہہ دو۔ کچھ بھی گا جاؤ۔ معافی ہی معافی ہے رب سوہنا تو پکڑ کرتا ہے اور اُسے رب سوہنے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ پیار بھی آتا تھا پر ڈر زیادہ لگتا تھا۔

گامو گھر میں جب بھی وہ کلام پڑھ رہا ہوتا، اللہ وسائی اُسے بغیر مخاطب کیے بیٹھی سنتی رہتی۔ اُسے گامو پر پہلے سے بھی زیادہ پیار آتا تھا اور اُسے یقین تھا، گامو اللہ کو بھی بڑا پیارا تھا اور گامو اُس کی ایسی باتیں سن سن کر شرما کر ہنستا۔ اس کا سانولا رنگ سرخ ہو جاتا اور وہ اللہ وسائی پر اور قربان جاتا۔ وہ اس کی نظر میں ملکہ حسن تھی اور اس کے چہرے پر وہ حسن صرف گامو کو ہی نظر آتا تھا جس کی زندگی کی دھوپ میں وہ چھاؤں کی طرح شامل ہوئی تھی۔ نہ گامو کو کبھی اُس کی تتلاہٹ بری لگی تھی نہ اُس کا چہرہ۔

وہ اللہ وسائی کو اللہ والی سمجھتا تھا کیونکہ وہ جو کہتی تھی پورا ہو جاتا تھا۔ اور اللہ وسائی اُس کی باتوں پر ہنستی تھی۔ ”توبہ کر پاکر گامو کس کو اللہ والی کہتا ہے۔“

وہ خود بھی کانوں کی کی لویں پکڑتی ناراض ہوتی اور اُسے بھی ڈراتی۔ وہ خود گامو کو مومن سمجھتی اور ہر دم درود اُس سے کرواتی یہ جاننے کے باجود کہ گامو کو قرآن نہیں آتا اور وہ نماز میں بھی مسجد میں صرف بسم اللہ پڑھ پڑھ کر آ جاتا تھا۔ پر اللہ وسائی کو پھر بھی یقین تھا کہ گامو کی دعا میں بڑا اثر تھا۔

گاؤں والے ان دونوں کو ہیر رانجھا کہتے تھے اور گامو اور اللہ وسائی کھل کھل ہنستے مور بن کے اتراتے پھرتے۔

☆☆☆

دور کہیں گامو کی آواز گونج رہی تھی۔ لفظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر اُس کی آواز کی گونج گامو کے گھر آنے سے پہلے اللہ وسائی تک پہنچ گئی تھی۔ وہ تیز تیز ہاتھ چلاتی آٹا گوندھنے لگی۔ جب تک گامو گھر پہنچا، وہ آٹا گوندھ کر مٹی کا چولہا جلا چکی تھی اور اب لکڑیوں میں پھونکیں مار مار کر اُس آگ کو تیز کر رہی تھی تا کہ توا جلد گرم ہو جائے۔ لوہے کی پھونکنی لکڑیوں میں پھنسائے پھونکیں مار مار کر اللہ وسائی نے بالآخر آگ تیز کر لی تھی جب گامو گھر کے کھلے دروازے کا پٹ کھول کر اندر آیا تھا۔

”لے بھلی مانس! آج تو چھاچھ آ گئی چوہدری صاحب کے گھر سے۔“

گامو نے سلام دعا کے بعد تانبے کے برتن میں پڑی چھاچھ اُس کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔

وہ اب اپنی مشک سے اپنے گھر کے باقی کے برتن بھر رہا تھا اور پھر وہ مٹی میں اٹے ہوئے اپنے ہاتھ، پاؤں چہرہ اور بال دھونے بیٹھ گیا تھا۔

اللہ وسائی نے پہلے گامو کے مونڈھے پر پڑے کپڑے میں بندھے دانے کھولے اور اُنہیں اُس خالی برتن میں ڈالتے ہوئے ہنسی جو آج خالی ہوا تھا اور آج ہی پھر بھر گیا تھا۔ پھر وہ چھاچھ کے برتن سے پیالوں میں چھاچھ اُنڈیلنے لگی تھی، گامو تب تک منہ ہاتھ دھو کے آ گیا تھا۔

”سن گامو! پیر صاحب ملیں گے نا ہم سے؟“

اُس کے سامنے روئی کی چنگیر رکھتی اللہ وسائی نے اُس سے پوچھا تھا۔

''کہوں نہیں ملیں گے چوہدری کرامت کے گھر آنے والی ہے اُن کی بیٹی بہو بن کر اور ہم اُن کی بیٹی کے ہونے والے سسرال سے ہوں گے۔ ہم سے کیوں نہیں ملیں گے''۔

گامو نے روٹی توڑنے سے پہلے چھاچھ کا گھونٹ لیتے ہوئے جیسے اکڑ کر کہا تھا۔

''لے توں آیا بڑا اسدھی۔'' اللہ وسائی ہنسی تھی گامو کی اکڑ دیکھ کر۔

''پیر صاحب بڑے نیک ہیں بھلی لوگ۔۔ کوئی گدی نہیں ہے اُن کی۔ کہتے ہیں اُن کو دعا ہے کسی کی کہ فیض ملے گا لوگوں کو اُن سے۔'' گامو روٹی کر کھاتے ہوئے جیسے اُسے بتا رہا تھا۔

جیسے پتا نہیں کتنے آتے ہیں اُن کے پاس اور وہ ہر ایک سے ملتے ہیں۔ کسی کو ٹھکراتے نہیں نا نہیں کرتے۔ گامو بڑا بڑی مرعوبیت بول رہا تھا۔

وہ آج برابر والے گاؤں میں پیر ابراہیم کے ڈیرے پر جانے والے تھے۔ پتا نہیں اولاد کے لیے انہوں نے کہاں کہاں دعا کرائی تھی مگر پیر ابراہیم کے بارے میں کسی نے بتایا ہی نہیں تھا اور اب جب سنا تھا تو گامو حیران تھا کہ پہلے کیوں نہیں سنا۔

''سنا ہے اُن کی بیٹی ست بھرائی ہے اور بڑی سوہنی ہے۔'' اللہ وسائی نے گاؤں کی عورتوں سے سنی سنائی باتوں کی تصدیق جیسے گامو سے کی تھی۔

''لے مجھے کیا پتا کو سوہنی ہے یا نہیں مگر ست بھرائی ہے پھر پیر صاحب کی بیٹی ہے۔ اُس کے خوش نصیب ہونے کو اتنا ہی کافی ہے۔''

گامو نے جواباً کہا تھا۔

''یہ تو نے ٹھیک کہا گامو!'' اللہ وسائی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

''اور دیکھ تو پنڈ کی عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر چوہدریوں کے گھر کی عورتوں کی باتیں نہ کیا کر ہمیں رزق ملتا ہے ان کے گھر سے ہم باتیں کرتے اچھے نہیں لگتے اُن کے بارے میں۔'' گامو نے جیسے بڑی سنجیدگی سے بیوی کو سمجھایا تھا۔

''میں باتیں نہیں کرتی گامو! عورتیں کرتی ہیں، میں تو بس سنتی ہوں''۔ اللہ وسائی نے جیسے اپنی صفائی دی۔ ''تو سنا بھی نہ کر اُٹھ جایا کر۔'' گامو نے کہا۔

اللہ وسائی نے چھاچھ کا پیالہ منہ سے لگا لیا۔

☆☆☆

پیر ابراہیم کا ڈیرہ کئی دہائیوں سے دعا کے لیے آنے والے لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ نہ روایتی پیر تھے نہ کوئی گدی نشین، نہ ہی وہ تعویز دھاگے کرتے تھے، پھر بھی لوگ اُن کے پاس آ کر بیٹھتے تھے، مسئلے بتاتے تھے دعا کرواتے تھے۔ لوگ کہتے تھے اُنہیں ان کے بچپن میں کسی بزرگ کی دعا لگی تھی اور جیسے ان کا ہاتھ فیض والا ہاتھ ہو گیا تھا۔ پیر ابراہیم کو اس کا احساس بڑے ہو کر ہوا تھا کہ فیض بانٹنے والے پر کیسا بھاری بوجھ ہوتا ہے۔

وہ جدی پشتی زمین دار تھے اور اُن کی شادی سید نہ ہونے کے باوجود سیدوں میں ہوئی تھی۔ وہ خود جتنی عبادت کرنے والے انسان تھے انہیں بیوی بھی ویسی ہی عبادت کرنے والی ملی تھی کہتے ہیں، جوانی کی عبادت اللہ کو بہت پیاری ہوتی ہے اور وہ دونوں میاں بیوی جوانی میں عبادت کرنے والے تھے اور پیر ابراہیم کو یقین تھا اُن سے ملنے والا فیض تب ہی جاری رہ سکتا تھا جب وہ خود سیدھے رستے پر رہتے۔ جس دن وہ اللہ کی حدیں توڑتے وہ ڈیرہ ختم ہو جاتا۔

گامو اور اُس کی بیوی ناشتہ کر کے اُس دن صبح سویرے نکلے تھے۔ جب تک وہ دوسرے گاؤں میں پیر ابراہیم کے ڈیرے پر پہنچے تو سہ پہر ہو چکی تھی اور انہیں وہ ڈیرہ خالی ملا تھا۔

''پیر صاحب سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔'' گامو نے ایک آدمی سے کہا جو ڈیرے کے باہر صحن میں کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا۔

''پیر صاحب تو اُٹھ گئے۔ جلدی آنا تھا۔''

اُس ملازم نے جواباً اُسے کہا تھا۔ گامو کچھ مایوس ہوا۔

''اٹھ گئے ہم تو دس میل چل کر آئے ہیں دوسرے گاؤں سے'' وہ ملازم ہنس پڑا تھا۔ ''یہاں تو لوگ بیس بیس میل چل کر بھی آتے ہیں۔ اگلے ہفتے آ جانا۔ وہ روز روز بیٹھتے بھی نہیں کہ میں تمہیں کہوں رات رک جاؤ اور کل مل کے چلا جانا۔'' ملازم نے جیسے بڑی لاپروائی سے اُن سے کہا تھا۔ گامو اور اللہ وسائی بڑی مایوسی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔

''بڑی مصیبت میں ہیں ہم بھائی۔۔ کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟'' اللہ وسائی نے اُس ملازم کی منت کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں سارے مصیبتوں والے ہی آتے ہیں کوئی تم اکیلے تھوڑی ہو ضرورت مند۔'' وہ ملازم کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔ گامو کندھے پر ڈالی ہوئی مشک سے اُس برتن میں پانی ڈالنے لگا۔ جو کبوتروں کے لیے رکھا تھا۔ اللہ وسائی کے برعکس وہ بڑا لاپرواہ نظر آ رہا تھا۔

''اب کیا ہو گا گامو؟'' اللہ وسائی نے اُس سے پوچھا۔ ''کچھ نہیں ہو گا چل واپس چلیں۔ اب اگلے ہفتے آ جائیں گے۔'' گامو چلتے ہوئے اُس امرودوں والے باغ کی طرف جانے لگا جہاں سے گزر کر وہ ڈیرے تک پہنچے تھے۔ اللہ وسائی نے یکدم

دلبرداشتہ ہوکر رونا شروع کر دیا۔

''تجھے کہا بھی تھا جلدی چل پر تو نے کہا نہیں پہنچ جائیں گے آرام سے۔'' وہ اب گاموسے لڑنے لگی تھی۔ ''مجھے کیا پتہ تھا اتنی دور ہوگا ڈیرہ میں کون سا روز روز آتا ہوں یہاں۔۔ پہلی بار آیا تھا ہوگئی بھول چوک آنے میں۔'' گاموں نے بیوی کو روتے دیکھ کر جیسے صفائی دی تھی۔

''میری قسمت میں ہے ہی نہیں اولاد، دوسری شادی کر لے گاموا!'' اس کے ساتھ چلتی اللہ وسائی یکدم بہت دل برداشتہ ہوکر بولی تھی۔

''جھلی ہوگئی ہے تو؟ اگر تیری قسمت میں نہیں ہے تو پھر سمجھ دونوں کی قسمت میں نہیں ہے۔ اس طرح مت مشورے دے مجھے۔'' گاموں نے اُسے جھڑک دیا تھا۔ ''تیرے سر پر سوتن لا کر کون بٹھائے گا۔''

''کیوں'' اپنی ناک چادر سے سڑکتی اللہ وسائی نے پوچھا۔

''تیری بددعائیں کون لے۔ کالی زبان ہے تیری'' گاموں نے کانوں کی لوویں چھوتے ہوئے کہا۔

''میں کیوں دوں گی تجھے بددعائیں۔'' اللہ وسائی بے ساختہ بولی۔ ''زبان سے نہیں دل سے تو دے گی نا۔۔ اور دل سے نکلی بددعا سیدھا دوزخ میں لے جاتی ہے بندے کو۔''

اس کی بات پر اللہ وسائی ایک بار پھر رونے لگی تھی۔

''نہ روجھلیے چل تجھے حق باہو صاحب کا کلام سناتا ہوں۔ راستہ کٹ جائے گا ہمارا۔'' اُس نے اللہ وسائی کا کندھا تھپک کر نرمی سے اُسے کہا تھا۔ اللہ وسائی نے ناک اور آنکھیں دوپٹے سے رگڑتے ہوئے صاف کر لی تھیں گاموا سے رونے نہیں دیتا تھا۔ پھایا بن کر اُس کے زخموں کو مندمل کر دیتا تھا۔

حق باہو کا کلام پڑھتے ہوئے گاموں نے مشک کا پانی امرود کے درختوں کو دینا شروع کر دیا۔

پیر ابراہیم نے اسی باغ میں ایک جگہ سے گزرتے ہوئے گاموں کی آواز میں وہ کلام سنا تھا۔ وہ کلام جتنا پرسوز تھا۔ اُس کو پڑھنے والے کی آواز اُس سے بھی زیادہ پرسوز، وہ مسجد میں امامت کرانے جاتے جاتے اُس آواز کے پھندے میں آئے تھے اور پھر جیسے کھینچے چلے آئے تھے اُس طرف جہاں سے گاموں کی آواز آرہی تھی، وہ ان ہی کا باغ تھا اور وہاں پرندے چہچہاتے تھے پر آج گاموں نے جو تان لگائی تھی، وہ پیر ابراہیم کے دل کو مٹھی میں لے گئی تھی۔ آواز کو کھوجتے انہوں نے ایک درخت کو پانی دیتے گاموں کو دیکھ لیا تھا اور اللہ وسائی کو بھی۔ اور جب گاموں سیدھا ہوا تھا تو اس نے پیر ابراہیم کو بھی دیکھ لیا تھا جو کافی دور تھے مگر ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔ گاموں یکدم چپ ہوگیا تھا۔ اُسے درختوں کے پار اُس آدمی کو دیکھ کر عجیب ہیبت آئی تھی حالانکہ وہ آدمی بے حد نرم لگتا تھا۔ پیر ابراہیم

اُس کے قریب آگئے تھے ''رُک کیوں گئے بھائی۔ پڑھتے رہو۔'' پیر ابراہیم نے اُس سے بڑی نرمی سے کہا تھا اور جیسے گاموں کو موقع دے دیا اپنا دل کھول کر رکھنے کا۔

''کیا پڑھنا ہے بھائی! پیر صاحب کو ملنے آئے تھے، وہ ملے ہی نہیں، دس میل چل کر آئے ہیں اب پھر دس میل چل کر جائیں گے۔'' پیر ابراہیم نے اس کی بات بغور سنی پھر اس سے پوچھا ''کہاں سے آئے ہو؟'' گاموں اب مشک کا باقی پانی دوسرے درختوں میں ڈالنے لگا تھا۔ ''جھوک جیون سے'' اُس نے پیر ابراہیم کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''پانی کیوں دے رہے ہو درختوں کو؟'' پیر ابراہیم کو اُس کی حرکت کچھ عجیب لگی تھی۔

''گاموں ماشکی ہوں، پانی پلانا کام ہے میرا پیر صاحب کے لیے اپنے کنویں کا میٹھا پانی لائے تھے۔ میری بس پائی جتنی اوقات تھی، پیر صاحب تو ملے نہیں۔ یہ سوکھے ہیں تو انہیں پلا رہا ہوں تاکہ پیر صاحب کو نہیں تو ان درختوں کو گاموں ماشکی یاد رہ جائے۔''

پیر ابراہیم اُس کی بات پر مسکرائے پھر آگے بڑھ کر انہوں نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر گاموں سے کہا۔

''لاؤ پلاؤ تاکہ میں بھی یاد رکھوں تمہیں۔'' گاموں ماشکی نے اُن کی بات پر توجہ دیئے بغیر مشک کا منہ بسم اللہ کہہ کر کھول کر پیر ابراہیم کے ہاتھوں کی اوک میں ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

پیر ابراہیم نے پانی کے کچھ گھونٹ لیے پھر گیلے ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا۔

''میٹھا ہے تمہاری آواز کی طرح۔'' اس سے پہلے کہ گاموں کچھ کہتا درختوں میں دو آدمی لپکتے ہوئے آئے تھے اور ان میں سے ایک نے پیر ابراہیم سے کہا۔

''پیر صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ میں پیالے میں لا کر پلاتا ہوں آپ کو۔'' گاموں ماشکی بے اختیار بدکا تھا اور اُس نے ہراساں ہوکر پیر ابراہیم کو دیکھا جو اب پانی پی کر سیدھے کھڑے ہو رہے تھے۔

''پیر ابراہیم صاحب ہیں آپ؟'' اُس نے اُن سے پوچھا پیر ابراہیم نے اس کے بجائے ان دونوں آدمیوں سے کہا۔

''تم لوگ جاؤ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں مسجد۔'' دونوں آدمیوں نے احترام سے سر جھکایا اور برق رفتاری سے وہاں سے چلے گئے تھے۔

''پیر صاحب ہمارے لیے دعا کر دیں۔''

اللہ وسائی نے تتلاتے ہوئے پیر ابراہیم سے کہا تھا۔ پیر ابراہیم نے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھے بغیر گاموں سے بڑی نرمی سے پوچھا۔

''کیا پریشانی ہے؟''

''دس سال ہوگئے ہیں پیر صاحب اولاد نہیں ہے۔ خالی گھر ہے ہمارا، لوگ کہتے ہیں آپ سید ہیں سیدوں کی دعا کبھی رد نہیں

ہوتی۔'' گاموماشکی کو رونا آ گیا تھا، پیرابراہیم کے انداز اور آواز میں کچھ نہ کچھ ایسا تھا کہ اُس کا دل چاہ رہا تھا وہ اُن سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روئے۔

''میں سید نہیں ہوں، میری بیوی سیدانی تھیں میں تو گناہ گار ہوں۔ اللہ کا بندہ۔'' پیرابراہیم نے بے اختیار کہا تھا۔

''اپنے آپ کو گناہ گار کہہ کر ہم کو گناہ گار نہ کریں پیر صاحب! بس ہمارے حق میں دعا کر دیں۔'' اللہ وسائی نے ہات جوڑ کر کہا تھا۔ پیرابراہیم یکدم خاموش ہوئے تھے ان پر جیسے کوئی عجیب سی کیفیت آنی شروع ہوگئی تھی اُن کا سرخ وسفید رنگ یکدم بہت سرخ ہونے لگا تھا اور چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے، کچھ بھی کہے بغیر انہوں نے اپنے ہاتھ کی کلائی میں لپٹی موتیوں کی تسبیح اتاری اور اس کو گاموکی اس کلائی میں پہنا دی جس سے وہ مشک کا منہ کھولتا تھا۔

'بیٹی دے گا اللہ سائیں۔ نیک۔۔ روپ والی۔۔ سات گاؤں جس کی بات کریں گے۔۔ اللہ نیک نصیب کرے اُس کے ۔۔۔ نیکوں سے واسطہ ڈالے۔'' وہ کہہ کر رکے بغیر وہاں سے چلے گئے تھے اور گاموا ور اللہ وسائی انہیں تب تک جاتے ہوئے بے یقینی سے دیکھتے رہے جب تک وہ غائب نہیں ہو گئے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد گاموں نے اپنی کلائی میں پہنائے جانے والے اس ہار کو پہلی بار دیکھا تھا جس کی خوشبو امرودوں کے باغ کی خوشبو کو گہنا رہی تھی۔ اُس نے اللہ وسائی کو دیکھا وہ روتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

دلہن بنی تاجور آنکھیں بند کیے بگھی کی سیٹ پر پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اُس کے قدموں میں بیٹھی اُسے پنکھا جھلتی شکوراں کی نظر تاجور کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ تاجور پر وہ روپ آیا تھا شکوراں نے کسی کسی دلہن پر دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے سے شکوراں کی نظر ہٹتی تو اُس کے قیمتی لباس اور گہنوں میں الجھ جاتی۔ اُس کے جسم پر کپڑوں سے زیادہ زیور نمایاں تھا، کون سا گہنا تھا جو اُس نے اس وقت نہیں پہن رکھا تھا۔ جھومر ٹیکے سے لے کر نولکھا ہار اور گلو بند تک کنگنوں سے لے کر پنجہ پازیبوں تک وہ سر تا پا زیور سے لدی تھی، شکوراں کی نظر الجھ الجھ جاتی، بھٹک بھٹک جاتی تاجور کی نیند نے جیسے اُسے ایک موقع دے دیا تھا کہ وہ اُسے سر سے پیر تک جی بھر کر دیکھے، وہ تاجور ہی کی ہم عمر تھی اور اُن کے گھر میں شروع سے تاجور کی خدمت گار تھی، وہ خدمت گار جسے اب تاجور کی شادی کے بعد اس کے ساتھ ہی بھیج دیا گیا تھا۔ شکوراں کچے پکے راستے پر چلتی اور ہر جھٹکے پر ہلتی بگھی کے اندر بیٹھی اُسے پنکھا جھل جھل کر تھک چکی تھی۔ تاجور اُسی کے کہنے پر چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر کے اور سر ٹکا کے بیٹھی تھی ورنہ نا اُس کا خیال تھا اتنے جھٹکوں میں اُسے نیند کہاں آنے والی تھی مگر پتا نہیں وہ کیسی تھکن تھی کہ بگھی کے اتنے جھٹکوں میں بھی کچھ دیر کے لیے تاجور کو اونگھ آ گئی تھی۔ مگر پھر بگھی کا پہیہ کسی بڑے گڑھے میں گر کر نکلا تھا اور تاجور بھی جیسے اُس جھٹکے سے گرنے لگی تھی جب شکوراں نے پھرتی سے اُسے سنبھالا تھا۔ تاجور نے جیسے کرنٹ کھا کر آنکھیں کھولیں اور اپنی نیند سے بھری آنکھوں کے ساتھ پہلے شکوراں کو اور پھر اُس بگھی کو

دیکھا اور پھر یکدم اُسے یاد آیا تھا کہ وہ آج بیاہ کر اپنے سسرال جا رہی تھی۔ پیرابراہیم کی ناز و نعم میں پلی بیٹی پرائی ہوگئی تھی۔ تاجور کا دل یک دم بھر آیا۔ وہ رخصتی کے وقت بھی روئی تھی اور پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی حالانکہ چوہدری کرامت پیرابراہیم کا پرانا دوست تھا پھر بھی تاجور پردیس جا رہی تھی۔

''نہ تاجور بی بی! اب نہ رونا۔'' شکوراں نے اس کی آنکھوں میں اُبھرتی نمی کو دیکھتے ہی لپک کر اُسے رومال پکڑایا تھا جس پر پھول کڑھے تھے جسے تاجور نے تھام کر اپنی آنکھیں اُس سے پونچھی تھیں۔

''ابھی کتنا رستہ باقی ہے؟ اُس نے شکوراں سے یوں پوچھا جیسے وہ بگھی چلا رہی تھی۔

''پتا نہیں تاجور بی بی! میں دیکھتی ہوں۔'' شکوراں نے کہہ کر بگھی کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور کھڑکی کو کھولنے کی کوشش کی۔ کھڑکی چند لمحوں میں ہی کھل گئی تھی، اور اُس کے کھلتے ہی گرم لو کے کچھ تھپیڑے اندر آئے تھے۔ وہ بگھی سوکھے کھیتوں کے بیچوں بیچ چلچلاتی دھوپ میں ایک کچے رستے پر ایک دوسری بگھی کے پیچھے دوڑ رہی تھی، جس میں چوہدری شجاع اور چوہدری کرامت بیٹھے ہوئے تھے ،اور تاجور کی بگھی کے پیچھے وہ تیس تانگے دوڑے چلے آ رہے تھے جو اس کی بارات لینے گئے تھے۔

''ہائے میرے ربا اتنا سوکھا۔۔۔ جھوک جیون میں تو پتا نہیں کب سے بارش نہیں ہوئی۔''

شکوراں جیسے باہر سوکھے کھیت دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ تاجور نے بھی کھلی کھڑکی سے ایک نظر باہر ڈالی تھی۔

پیرابراہیم نے اُسے بتایا تھا کہ چوہدری کرامت کے گاؤں میں تین سال سے بارش نہیں ہوئی اور چوہدری کرامت نے تاجور کا رشتہ بھی اسی امید اور آس پر لیا تھا کہ پیرابراہیم کی بیٹی جس جگہ جائے گی خوشحالی لے کر آئے گی۔ تاجور کی خوش بختی کے کچھ ایسے ہی چرچے تھے ہر طرف۔

پیرابراہیم نے تاجور کا رشتہ کرتے ہوئے اُس سے اس کی مرضی پوچھی تھی، اور پھر اُسے چوہدری شجاع کو دور سے دکھا بھی دیا تھا اور تاجور نے بڑی خوشی سے چوہدری شجاع کے رشتے کے لیے ہاں کی تھی۔ وہ خوبرو تھا اور چوہدری کرامت کی حویلی میں چوہدرائن کی وفات کے بعد کوئی عورت نہیں تھی۔ تاجور نے جا کر جیسے وہ جگہ سنبھالنی تھی۔ وہ حاکمانہ مزاج رکھتی تھی اور اپنے باپ کے عقیدت مندوں کی عقیدت سے واقف تھی۔ وہ اپنے حسن پر تازاں تھی اور ست بھرائی کے اعزاز پر بے حد مغرور۔۔ تاجور نے ''تھوڑ'' کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ نہ رنگ روپ میں، نہ عزت میں نہ پیار میں، نہ رزق میں اور نہ ہی قدر میں، باپ اُسے اس کی ماں کی وفات کے بعد اگر ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھتا تھا تو سات بھائی اُسے پلکوں پر اٹھائے پھرتے تھے تاجور نے نہ کبھی سنی ہی نہیں تھی اور ہاں کہنے کی اُسے عادت نہیں تھی۔

''بیٹا! شوہر کی عزت کرنا اُس کی پگڑی کا شملہ کبھی اپنے کسی کام سے نیچے نہ ہونے دینا۔''

پیرابراہیم نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا تھا۔وہ شاید کچھ اور بھی کہتے مگر اُس کے سسر نے آگے بڑھ کر انہیں روک دیا تھا۔

''تمہاری بیٹی نہیں رہی اب ابراہیم! ہماری بیٹی ہوگئی ہے اور میری بیٹی کو اتنی نصیحتیں مت کرو۔'' وہ بچپن کے دوست تھے، ایک دوسرے سے اس طرح کی باتیں کر لیتے تھے، ورنہ پیرابراہیم کے سامنے تو کوئی سر اٹھا کر بھی کھڑا نہیں ہوتا تھا۔

''اس کو راج کروانے کے لیے لے کر جا رہا ہوں حکم دینے کے لیے۔حکم سننے کے لیے نہیں۔'' انہوں نے کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔پیرابراہیم مسکرا کر رہ گئے تھے۔تاجور کا سر کچھ اور اٹھ گیا تھا۔

شکوراں ایک بار پھر کھڑکی سے گردن باہر نکال کر دیکھنے لگی تھی اور اُس بار اُسی نے یک دم خوشی سے جیسے قلقاری مارتے ہوئے تاجور سے کہا۔

''تاجور بی بی! میں نے بدلیاں دیکھیں کالی ہیں اس طرف۔'' ہاتھ کے اشارے سے تاجور کو ایک سمت کا بتا رہی تھی۔تاجور نے بے یقینی سے اُسے دیکھا پھر خود بھی کھڑکی سے باہر جھانک اُس نے سوکھے کھیتوں کے پار آسمان پر واقعی سیاہ بادل امڈتے دیکھے۔

''آج آپ جھوک جیون آئی ہیں اور آج آپ کے برکت والے قدموں کے صدقے اللہ نے جھوک جیون کی زمین کی سن لی۔'' شکوراں نے جیسے لہکتے ہوئے کہا۔تاجور کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

وہ بادل صرف ان دونوں نے نہیں دیکھے تھے اگلی بگھی میں بیٹھے چوہدری کرامت اور چوہدری شجاع نے بھی دیکھے تھے۔اور پیچھے بھاگتے ٹانگوں میں بیٹھی ہوئی بارات نے بھی۔پلک جھپکتے میں اُن بدلیوں نے آسمان گھیرا تھا اور پھر برسنے لگا تھا۔

جھوک جیون میں کوئی ایسا آیا تھا جس کے وجود کی برکت نے آسمان سے وہ پانی برسا دیا تھا جس کے برسنے کی دعائیں وہاں کے لوگ تین سالوں سے کرتے پھر رہے تھے۔

بگھی اب سرپٹ دوڑنے کے بجائے اُس برستے مینہہ میں بہت سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی، اور اندر تاجور کسی ملکہ کی طرح غرور سے تن کر بیٹھی کھلی کھڑکیوں سے آنے والی بارش کے پانی میں بھیگے ٹھنڈے جھونکوں سے محظوظ ہو رہی تھی، اور شکوراں ہمیشہ کی طرح تاجور بی بی کی خوش بختی کی کرامت دیکھتے ہوئے اُس پر قربان جا رہی تھی۔سوکھے کھیت پانی کو یوں پی رہے تھے جیسے پتا نہیں کب سے پانی کے لیے ترسے تھے۔وہ کچا رستہ جس پر بگھی بھاگ رہی تھی وہ بھی ابھی تک تیز بارش کے باوجود کیچڑ میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔زمین پانی پی رہی تھی اور پانی پیتی ہی جا رہی تھی۔

''دیکھ شجاع! پیروں کی اولادوں کا نصیب اور برکت دیکھی تو نے۔اُن کے قدم جہاں پڑتے ہیں ویرانے آباد ہو جاتے

ہیں۔بنجر زمین پھوٹنے لگتی ہے۔''

چوہدری کرامت اگلی بگھی میں برستی بارش میں سفر کرتے ہوئے چوہدری شجاع سے کہہ رہا تھا۔

''بس تاجور کا کبھی دل نہ دکھانا کبھی کسی چیز کے لیے منع نہ کرنا اُسے، وہ سیاہ کا سفید کرے سفید کو سیاہ کرنے دینا وہ پیرابراہیم کی بیٹی ہے۔اُس کے طفیل بھاگ لگے رہیں گے تجھے بھی تیری نسل کو بھی''

چوہدری کرامت نے حویلی پہنچنے کے رستے میں جیسے بیٹے کے لیے زندگی گزرنے کی حد بندی کر دی تھی۔وہ حویلی میں ملکہ نہیں بادشاہ لا رہا تھا۔

تاجور برستی بارش میں حویلی پہنچی تھی اور چوہدریوں کی بہو دیکھنے کے لیے گاؤں کے وہ سارے لوگ اُمڈ آئے تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے بارات کے ساتھ نہیں جا سکے تھے، ورنہ چوہدری کرامت نے پورے گاؤں کو بیٹے کی بارات میں مدعو کیا تھا۔

تاجور بگھی سے چادر کا گھونگھٹ کاڑھے حویلی کے صحن میں اتری تھی۔کسی نے اُس پر چھتری تان لی تھی کسی عورت نے اس کا منہ نہیں دیکھا تھا نہ کسی کو اتنی ہمت ہوئی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر دلہن کا منہ دیکھنے کے لیے چادر ہٹاتا۔اُس کا رعب اس لیے تھا کہ وہ چوہدریوں کی بہو تھی اور دھاک اس لیے بیٹھ گئی تھی کہ پیروں کی وہ بیٹی جھوک جیون میں بارش کے ساتھ آئی تھی۔

شکوراں کسی باڈی گارڈ کی طرح تاجور پر تنبو جتنی لمبی ریشمی کڑھائی والی کالی چادر ڈالے اُس کو ان عورتوں سے گزارتے ہوئے اندر لے جا رہی تھی اور انہیں ان ہی عورتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے تاجور نے پہلی بار گاما ماشکی اور اللہ وسائی کا نام سنا تھا۔ایک عورت کسی دوسری سے کہہ رہی تھی۔

''کیا خوش بخت اولاد دے گا موما شکی کی کہ آج دائی نے اللہ وسائی کو پیٹ سے ہونے کی خبر دی اور آج ہی بارش ہونے لگی۔گاموتو مٹھائیاں بانٹتا پھر رہا ہے پورے گاؤں، میں حالانکہ ابھی پہلے مہینے ہی کون مٹھائیاں بانٹتا ہے۔'' دوسری عورت نے ہنس کے کہا تھا۔''مجھے لگتا ہے بیٹا ہوگا۔''

''مجھے لگتا ہے بیٹی ہوگی اس لیے کے بارش رحمت بن کر آئی ہے۔''

تاجور وہاں سے بھسم ہوتے ہوئے گزری تھی۔وہ پورا رستہ اپنی برکت اور بخت کی باتیں سنتی آئی تھی اور یہاں کسی نے ایک لمحے میں کسی اور کو اُس کے بخت اور برکت کے ہم پلہ کر دیا تھا اور وہ بھی وہ جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا، بس ماں کے پیٹ میں آیا تھا۔تاجور کا بس چلتا تو وہ ان عورتوں کو کھڑے کھڑے وہاں سے نکال دیتی وہ بھی دھکے دے کر، وہ اُس کے محل کے درباری تھے، کسی اور کے قصیدے کیسے پڑھ سکتے تھے۔

وہ ''آنے والا'' تاجور کے دل و دماغ سے چپک بیٹھ گیا تھا۔جھوک جیون میں چوہدری کرامت چوہدری شجاع کے بعد گاموں

اللہ وسائی اور اُن کا ہونے والا بچہ وہ پہلے تین لوگ تھے، جن سے تاجور متعارف ہوئی تھی وہ تعارف نہیں تھا وہ تیروں کی طرح اُس کے سینے پر لگا تھا۔

''کوئی اندر نہ آئے۔۔۔ میں آرام کروں گی، اپنے کمرے میں پہنچتے ہی تاجور نے شکوراں سے سرگوشی میں کہا تھا۔ ملکہ کو تخلیہ چاہیے تھا اُس آگ کو بجھانے کے لیے جو چند جملوں نے لگا دی تھی۔

☆☆☆

''یہ گاموکہاں ہے۔ کوئی اسے لائے آ کر حق باہو کا کلام پڑے۔'' چوہدری کرامت کو حویلی پہنچتے ہی گاموں یاد آیا تھا۔ اور ساتھ ہی کسی نے انہیں گاموکے گھر اولاد کی خوشی خبری کے بارے میں بتا دیا تھا۔ چوہدری کرامت دل سے خوش ہوا تھا اور اُس کا یہ یقین بھی پختہ ہوا تھا کہ اُس کی بہو کے قدم پڑتے ہی صرف بارش نہیں آئی بے اولادوں کی گودیں بھی ہری ہونے لگی تھیں۔

''بلاؤ گاموکو مجھے کیوں اُس نے سب سے پہلے یہ خبر نہیں دی''۔ چوہدری کرامت کے کہنے پر گاموکی ڈھنڈیا مچی تھی اور وہ چوہدری کرامت کے سامنے آتے ہی اپنا رتبہ اوقات سب بھولتے ہوئے روتے ہوئے اُس کے گلے لگ گیا تھا۔ چوہدری کرامت اُسے تھپکتے ہوئے تمناک ہو گیا۔

''چل گاموا! پڑھ حق باہو کا کلام۔ میرے بیٹے کی بارات آئی ہے، اور تیرے گھر اولاد کی خوش خبری آئی ہے چل پڑھ اسی خوشی میں۔'' چوہدری کرامت نے اُسے کہا تھا اور ساتھ ہی اپنے ملازموں کو کہا کہ گاموکے گھر آنے والی اس خوش خبری پر پورے گاؤں میں مٹھائی چوہدریوں کی طرف سے بٹے گی۔ گاموجیسے چوہدری کرامت کی اس عنایت پر اور مٹی ہو گیا تھا

☆☆☆

نہ میں عالم نہ میں فاضل نہ مفتی نہ قاضی ہو
نہ دل میرا دوزخ منگے نہ بیشتیں راضی ہو
نہ میں تیرے روزے رکھے نہ میں پاک نمازی ہو
باجھ وصال اللہ دے باہو دنیا کوڑی بازی ہو

اندر اپنے کمرے میں شربت پیتی تاجور گاموماشکی کی آواز پر ٹھٹکی تھی۔ اُس نے شکوراں کو دیکھا جو اُسی کی طرح جیسے ساکت بیٹھی تھی۔

''یہ کون ہے؟'' گاموسانس لینے کے لیے رکا تو تاجور نے شکوراں سے پوچھا تھا۔ شکوراں جلدی سے اُٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ تاجور اک بار پھر گاموماشکی کو سننے لگی تھی۔ شکوراں واپس اندر آئی اور اُس نے بتایا۔

''گاموماشکی ہے کوئی''۔

تاجور بری طرح چونکی تھی، اُس نے شکوراں سے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ شربت پیتے ہوئے وہ کلام سنتی رہی اور شکوراں بھی گم صم وہاں بیٹھی رہی۔'' جب گاموماشکی کی آواز بند ہو گئی تو شکوراں نے اپنے بازو تاجور کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

''بی بی صاحبہ! دیکھیں میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں اس آدمی کی آواز سن کر۔''

تاجور نے ایک نظر شکوراں کو دیکھا پھر بے حد سرد آواز میں اُس سے کہا۔

''باہر مردان خانے میں کسی کے ہاتھ پیغام پہنچاؤ کہ وہاں سے کوئی آواز اندر زنان خانے میں نہیں پہنچنی چاہیے۔ جو مردان خانے میں بیٹھے، آواز نیچی کر کے بیٹھے۔ ہم سیدوں کی اولاد ہیں۔ مردوں کی آوازوں سے بھی پردہ کرتے ہیں۔'' شکوراں تاجور کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی مگر کوئی سوال کیے بغیر وہ برق رفتاری سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''تو کدھر جا رہی ہے اللہ وسائی؟'' حویلی کی طرف سے آتی ہوئی عورتوں میں سے ایک نے اللہ وسائی سے کہا جو حویلی جانے والے راستے پر اُنہیں نظر آئی تھی۔

''میں چوہدریوں کی بہو دیکھنے جا رہی ہوں، بارات میں نہیں جا سکے میں اور گاموں۔ میری طبیعت خراب تھی صبح سے۔ اب سنبھلی ہے تو آئی ہوں۔'' اللہ وسائی نے کہا۔

''ارے جا کر آرام کر۔ اس حالت میں اس طرح لور لور نہیں پھرتے اور چوہدریوں کی بہو نے گاؤں کی کسی عورت کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا کھوٹا، کرے گی وقت خوامخواہ جا کے''۔ ایک عورت نے اُسے منع کیا تھا۔

نہ نہ میں تو ضرور جاؤں گی۔'' گاموماشک کی بیوی ہوں، مجھے کیسے انکار کریں گے چوہدری صاحب''۔ اللہ وسائی نے اُن کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے قدم بڑھا دیئے تھے۔ موسلا دھار بارش اب ہلکی پھوار میں تبدیل ہو گئی تھی مگر پھر بھی حویلی پہنچتے پہنچتے اللہ وسائی کے کپڑے بھیگ چکے تھے۔

بڑی چوہدرائن کے ہوتے ہوئے اللہ وسائی حویلی کام کاج اور دانے لینے کے لیے آتی رہتی تھی۔ اس لیے اُسے حویلی کے ہر کمرے کا پتا تھا۔

وہ شکوراں تھی جس نے بھیگے ہوئے کپڑوں والی اللہ وسائی کو روکا تھا اللہ وسائی کے ہاتھوں میں موتیا کے پھولوں کی ٹوکری تھی وہ اپنی چپل باہر والے برآمدے میں اتار کر اندر تھی۔

''کدھر آ رہی ہے تو؟'' شکوراں نے اُسے چوہدری شجاع کے کمرے کے باہر جھڑکا اور اللہ وسائی کو بُرا لگا۔

''میں گاموماشکی کی بیوی ہوں اللہ وسائی۔ بہو کی منہ دکھائی کے لیے آئی ہوں۔'' اندر آئینے کے سامنے دوپٹہ ٹھیک کرتی تاجور

باہر سے آتی آواز سن کر ساکت ہوئی تھی۔

''تجھے بتایا نہیں کسی نے کہ بہو صاحب نہیں ملیں گی کسی سے؟'' شکوراں نے اُسی انداز میں اس سے کہا۔

''مجھ سے مل لیں گی۔ میں گاموماشکی کی بیوی ہوں۔ وہ ماشکی ہے سارے گاؤں کا۔ اُسے کوئی انکار۔۔۔'' شکوراں نے بے حد تمیزی سے اُس کی بات کاٹی۔

''تجھے ایک بار کہہ دیا نا کہ بہو صاحبہ نہیں ملیں گی اور۔'' اس سے پہلے کہ شکوراں کچھ کہتی، اندر سے تاجور نے آواز دی تھی۔

''اسے آنے دو اندر۔'' شکوراں بے یقینی سے کھڑی رہ گئی۔ اللہ وسائی نے بڑے تفاخر سے اُسے دیکھا اور اُس دروازے کی طرف بڑھ گئی جو شکوراں نے اُس کے لیے کھولا تھا۔

اللہ وسائی کمرے میں جھجکتے ہوئے داخل ہوئی تھی۔ تاجور سامنے ہی کھڑی تھی۔ اور اُس پر پہلی نظر ڈالتے ہی اللہ وسائی فدا ہوگئی تھی۔

''یا اللہ میری بیٹی کو بھی ایسا حُسن دینا کہ جو دیکھے میری طرح دیکھتا ہی رہ جائے''۔ اُس کے اندر کہیں ایک خواہش پیدا ہوئی تھی۔

تاجور بھی اُسے اسی طرح پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ اللہ وسائی آگے بڑھی تھی اور اُس نے پھولوں کی ٹوکری تاجور کے قدموں میں رکھ کے اُس کے مہندی رچے حسین پیر پکڑ کر رونا شروع کر دیا تھا، ایک لمحہ کے لیے تاجور حواس باختہ ہوئی۔

''پیر صاحب کی دعا سے دس سال بعد آج گود ہری ہوئی ہے میری۔ انہوں نے دعا دی تھی مجھے کہ بیٹی ہوگی اور میں آج اُن کی بیٹی کے پیر دھونے آئی ہوں۔'' اللہ وسائی نے روتے اور تتلاتے ہوئے تاجور کو بتایا تھا اور تاجور کے جلتے وجود پر جیسے پانی نہیں شبنم گری تھی۔ تو اُس کوکھ میں آنے والی اولاد بھی اُس کے باپ کی دعاؤں کے طفیل تھی اور جس کی کوکھ ہری ہوئی تھی، وہ احسان فراموش نہیں نکلی تھی نہ ہی اپنی اوقات بھولی تھی وہ وہیں آ کر بیٹھی تھی جہاں اُسے بیٹھنا چاہیے تھا۔

تاجور کی آگ نہیں بجھی۔ غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

''چل اٹھ، پیر دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اُس نے اللہ وسائی کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑا لیے تھے۔ اللہ وسائی نے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کیے اور وہیں زمین پر بیٹھے موتیا کے پھولوں کے گجروں والی ٹوکری تاجور کی طرف بڑھا دی۔

''ہماری اوقات بس یہی لانے کی ہے۔ پیر صاحب نے بھی میرے گاموکو یہی پھول دیے، تھے میں بھی آپ کے لیے انہیں پھولوں کا گجرا لائی ہوں۔''

وہ تتلاتے ہوئے۔ کہتی گئی تھی۔ تاجور نے ایک نظر اُن پھولوں کو دیکھا پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے رکھ دے اسے وہاں۔۔ اور شکوراں کسی سے کہہ اسے پانی پلا دے۔''

یہ جیسے اس بات کا اشارہ تھا کہ اللہ وسائی اب یہاں سے جائے۔

شکوراں ''جی بی بی صاحبہ!'' کہہ کر اُسے لے کر وہاں سے چل دی تھی۔ تاجور فرش پر پڑی پھولوں کی اُس ٹوکری کو دیکھتی رہی جس سے اٹھنے والی خوشبو نے لمحوں میں اُس کے پورے کمرے کو معطر کر دیا تھا۔ شکوراں کچھ دیر بعد اندر آئی اور اُس نے آ کر ٹوکری اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کہاں رکھوں؟''

''باہر پھینک دو۔''

تاجور نے عجیب بے نیازی سے کہا۔ وہ اب سیج پر بیٹھنے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ شکوراں پھول لیے باہر آ گئی مگر انہیں پھینکنے کے بجائے اُس نے وہیں برآمدے میں انہیں دروازے کی چوکھٹ پر لٹکا دیا۔ موتیا کے گجرے وہاں لٹکے اب اپنی خوشبو ہر طرف پھیلا رہے تھے۔

وہ چوہدری شجاع تھا جس نے اندر آتے ہوئے موتیا کے اُن خوبصورت گجروں کو دیکھا تھا اور انہیں تاجور کی کلائیوں میں پہنانے کے لیے اتار لیا تھا یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ گجرے تاجور کے لیے اُس کے باپ نے اپنے باغ سے چنوا کر بنوائے تھے۔

اُس رات اپنی سیج پر موتیا کے اُن گجروں کو پہنتے ہوئے تاجور کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اللہ وسائی کے ہاتھوں کے بنے گجرے تھے جنہیں اُس نے باہر پھنکوایا تھا مگر جو چوہدری شجاع کے ہاتھوں اُس کی کلائیوں میں آ کر لپٹ گئے تھے۔ اُس کی سیج کی زینت بن گئے تھے۔

☆☆☆

تاجر بی بی ایسی حسین ہیں گاموا! کہ اُن سے نظر نہیں ہٹتی، میں تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

اللہ وسائی نے اُس شام گاموکو تاجور کے بارے میں بڑے اشتیاق سے بتانا شروع کیا تھا جب گامو نے اُسے ٹوک دیا۔

''نہ نہ اللہ وسائی! پیر صاحب کی بیٹی کے حسن کے بارے میں کسی غیر محرم سے بات نہ کر! سیدوں کی بیٹیوں کے پیچھے بھی اُن کے بارے میں بات نہیں کرتے''۔

''پتا ہے مجھے پھر میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ دیکھنے میں کیسی لگتی ہیں۔''

''کچھ نہ بتا مجھے اور نہ ہی مجھے سننا ہے۔ بس تو اُن سے پوچھ کر اُن کی خدمت کے لیے چلی جایا کر۔'' گامو نے اُس سے کہا تھا۔

''لے ایک طرف تو مجھے کام کرنے سے روک رہا ہے اور دوسری طرف اُن کی خدمت کے لیے جانے کے کہہ رہا ہے۔''

اللہ وسائی نے ہنس کر جیسے گاموکو یاد دلایا تھا۔

''اُن کی خدمت کرنے سے کچھ نہیں ہوگا تجھے۔ اُنہیں کے گھر کے طفیل تو رب سوہنے نے نوازا ہے ہمیں''۔

''ہاں یہ بھی ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ پر تجھے وہاں کلام پڑھنے سے کیوں روک دیا انہوں نے؟''

''جھلی بتایا تو ہے، سیدوں کی بیٹیاں غیر محرموں کی آوازوں سے بھی پردہ کرتی ہیں۔ میری ہی غلطی تھی، میں اتنی اونچی آواز میں کلام پڑھنے بیٹھ گیا۔ اب ہمیشہ نیچی آواز میں کلام پڑھوں گا وہاں۔'' گاموجیسے خود ہی اپنی اصلاح کرتے ہوئے بولا۔

''گامو! میں موتیا کے گجرے لے کر گئی تھی اُن کے لیے۔ اپنے ہاتھوں سے بنا کر۔۔۔ پتا نہیں انہوں نے پہنے یا نہیں''۔

اللہ وسائی کو رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ اُن پھولوں کو اُس نے طبیعت خراب ہونے کے باوجود بھی صبح سویرے جگہ جگہ سے چنا تھا۔

''تو نے دل سے بنائے تھے تو انہوں نے ضرور پہنے ہوں گے۔'' گامو نے جیسے اُس کی دل جوئی کی تھی۔

''ہاں بنائے تو دل سے ہی تھے۔''

یہ پھول پروتے ہوئے کتنی بار سوئی لگی ہے انگلیوں میں''۔

اُس نے گامو کے سامنے اپنے ہاتھ کرتے ہوئے کہا۔ گاموجیسے تڑپ اٹھا تھا۔

''جھلیے احتیاط سے کام کرنا تھا کیسے ادھیڑ لی ہیں اپنی انگلیاں اب کوئی سینے پرونے کا کام نہیں کرنا تو نے، پھول تک نہیں پرونے تو نے۔''

اللہ وسائی منہ میں دوپٹہ دبائے ہنستی ہی چلی گئی۔

لو بھلا اب تو پھولوں سے بھی دور رکھے گا مجھے۔ ابھی تو پھولوں کا وقت آیا ہے۔ میں نے تو اپنی بیٹی کا نام بھی موتیا ہی رکھنا ہے۔ گاموتا کہ اُس کے حسن کی خوشبو بھی پوری دنیا میں پھیلے''۔

گامو نے پیار سے اُسے دیکھا۔

''لے تو نے نام بھی سوچ لیا اور مجھ سے مشورہ بھی نہیں کیا''۔

''میں نے نام نہیں سوچا، پیر صاحب نے موتیا ہی پکڑایا تھا نا تجھے، میں نے تو اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ اللہ اچھا وقت لائے تو بس موتیا ہی نام ہوگا اُس کا۔'' اللہ وسائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گامو سر ہلاتا چلا گیا۔

''ہاں پیر صاحب نے تو موتیا ہی دیا تھا۔ تو بس موتیا ہی ہوگا اُس کا نام۔''

☆☆☆

شکوراں نے اگلی صبح وہ گجرے تاجور کے بستر کے برابر پڑی میز پر دیکھے تھے اور اُس نے پلک جھپکتے میں اُنہیں پہچانا تھا۔

''یہ گجرے یہیں رہنے دینا، چوہدری صاحب نے پہنائے تھے مجھے۔ مرجھا بھی جائیں نا تو کوڑے میں مت پھینکنا۔ کہیں مٹی میں دبا دینا۔''

اپنے گیلے بال سلجھاتے ہوئے تاجور نے شکوراں سے کہا تھا اور شکوراں ڈر کے مارے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ اللہ وسائی کے گجرے تھے۔

''جی بی بی صاحبہ!'' کہہ کر وہ بات گول کر گئی تھی۔ صبح سویرے اپنی شامت بلانے کا اُس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☆☆☆

''یہ پانی کتنا کھاری ہے۔'' ناشتے پر تاجور نے پانی کا ایک گھونٹ بھرتے ہی چوہدری شجاع سے ناک بھوں چڑھا کر کہا تھا۔

''اچھا۔۔۔ نہیں مجھے تو ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔ گھر کی کھوئی کا پانی ہے۔'' شجاع نے اپنی حسین جمیل بیوی کی چڑھی ہوئی ناک اور ماتھے کے بل دیکھے اور پانی کا ایک گھونٹ لے کر جیسے پانی چکھا، اُسے وہ ٹھیک ہی لگا تھا۔

''ہمارے گھر کا پانی بڑا میٹھا ہوتا ہے۔'' میں بابا جان سے کہوں گی، وہ بھجوا دیا کریں۔'' تاجور نے وہ پانی وہیں اُسی طرح گلاس میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''اتنا کھاری پانی تو میرے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔''

شجاع اُس کی بات پر ہنس پڑا تھا۔ دس میل دور ہے تمہارا گاؤں۔۔ کیسے بھیجیں گے اور کتنا بھیجیں گے۔'' شجاع نے جیسے اُسے یاد دلایا۔

''وہ بھیج دیں گے میرے لیے روزانہ۔۔ ہر روز ایک بھائی بھی دینے آئے تو آٹھ دن تو گھر کے لوگ ہی بھگتا دیں گے پھر اُن سمیت ملازم وغیرہ آ جائیں گے۔''

شجاع نے لاڈ پیار اور ناز و نعم کی اُس انتہا کے بارے میں سوچا تھا جس کی عادی اُس کی نئی نویلی دلہن تھی۔

''بیٹا! اب گھر کے مرد پانی ڈھوتے اچھے تھوڑی لگتے ہیں۔ گاؤں کے کنویں کا پانی بڑا میٹھا ہوتا ہے میں گاموماشکی سے کہوں گا، وہ دے جایا کرے گا تمہارے لیے پانی۔''

چوہدری کرامت نے اُن کی گفتگو میں پہلی بار مداخلت کی۔ تاجور کے ذہن میں گاموماشکی کا نام گونجا تھا۔ اُس نے صرف چوہدری کرامت کو دیکھا پر کچھ کہا نہیں۔

پندرہ منٹ بعد گاموماشکی حویلی پانی پہنچا گیا تھا اور تاجور ذہن بنائے بیٹھی تھی کہ وہ اس میں بھی نقص نکالے گی۔ مگر پہلا گھونٹ

لیتے ہی تاجور کچھ بول نہیں سکی تھی۔ وہ ایسا ٹھنڈا میٹھا پانی تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی غٹا غٹ پیتی چلی گئی۔ چوہدری کرامت اور شجاع نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

''ہاں، یہ کچھ بہتر ہے پر ہمارے گھر کے کنویں جیسا نہیں ہے۔''

تاجور نے گلاس رکھ کر دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا تھا۔ چوہدری کرامت ہنس پڑا تھا۔

''وہ پیر ابراہیم کے گھر کا پانی ہے، اُس کا اور میرے گھر کے پانی کا کیا مقابلہ۔ اب تم آ گئی ہو تو میرے گھر کے کنویں کے پانی میں بھی وہی مٹھاس آ جائے گی۔ ان شاءاللہ''۔

تاجور کچھ بول نہیں پائی، چوہدری کرامت کی اس بات کے بعد۔ گاموماشکی کے لائے ہوئے پانی کا ذائقہ اُس دن تاجور کی زبان پر پانی کا ذائقہ سارا دن رہا، چوہدری کرامت کے سامنے یہ اعتراف نہیں کر سکی کہ گاؤں کے کنویں کا وہ پانی جو گاموماشکی لایا تھا، وہ پیر ابراہیم کے گھر کے پانی سے بھی میٹھا اور ٹھنڈا تھا۔

☆☆☆

گندم کی ایک بوری کا منہ کھلا ہوا تھا اور اُس کے برابر میں گندم کی چند اور بوریاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ تاجور برآمدے میں ایک اونچے موڑھے پر بڑے کروفر سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اُس کے پاس شکوراں اور کچھ دوسری ملازمائیں تھیں۔ حویلی کے صحن میں عورتیں قطار بنائے کھڑی تھیں اور باری باری آگے آ کر اس حویلی کی نئی بہو سے پہلی خیرات لے رہی تھیں۔ شکوراں برتن بھر بھر کے بوری سے دانے تاجور کو دیتی اور وہ عورتوں کی جھولی، چادر یا لائے ہوئے برتنوں میں اُنڈیل دیتی اور ساتھ اُن کی دعائیں لیتی اور بڑے کروفر سے اُن دعاؤں کا جواب بھی دیتی۔

لیکن کسی کو آگے بڑھ کر خود کو چھونے نہ دیتی۔ اللہ وسائی بھی اُسی قطار میں کھڑی تھی جب اُس نے ایک بوڑھی عورت کو آگے بڑھ کر تاجور کے سر پر پیار دینے کی کوشش کرتے دیکھا اور تاجور کو بے حد زاری کے ساتھ اُس کا ہاتھ جھٹکتے دیکھا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے اماں!'' اُس کے کہنے پر شکوراں نے بڑی درشتی سے اُس عورت کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا؟

''پتا نہیں لگتا تم لوگوں کو۔۔ کتنے گندے ہاتھ ہیں تیرے اور بی بی صاحبہ کے سر پر پھیر کر اُن کے بال بھی گندے کرے گی۔ پا کی پلیدی کا کچھ پتا نہیں تجھے۔'' وہ عورت کچھ خجل سی ہو گئی اور اُس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''اللہ بی بی اور چھوٹے صاحب کی جوڑی سلامت رکھے۔''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ اب دانے لے اور آگے چل''۔

شکوراں نے کٹوری تاجور کو پکڑاتے ہوئے اُس عورت کی چادر پھیلائی تھی اور تاجور نے کچھ کہے بغیر اُس میں دانے ڈال

دیے تھے۔

اللہ وسائی کے آگے آنے سے پہلے ہی تاجور اُسے دیکھ چکی تھی اور تاجور کی نگاہ جہاں مرکوز ہوئی تھی یہ کیسے ممکن تھا کہ شکوراں تاجور کی نگاہ نہ پہچانتی۔

''آؤ اللہ وسائی!'' تاجور نے خود اُسے نام لے کر پکارا تھا اور جیسے پورے گاؤں کی عورتوں کے سامنے لمحہ بھر کے لیے اللہ وسائی کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ چوہدریوں کی بہو کو نہ صرف اُس کا چہرہ یاد تھا بلکہ نام بھی یاد تھا۔

''بابا جان کی دعا سے دس سال بعد گود ہری ہو رہی ہے نا تمہاری۔'' تاجور نے بلند آواز میں پورے گاؤں کے سامنے اعلان کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ اللہ وسائی اُسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑی رہی۔

''اسے دو کٹوری دینا۔۔ یہ تو تلی بھی تو ہے نا۔''

تاجور نے مسکراتے ہوئے شکوراں سے کہہ کر اللہ وسائی کو دیکھا جس کا رنگ فق ہوا تھا اور وہاں کھڑی عورتوں کی پوری قطار نے جیسے بیک وقت قہقہہ لگایا تھا۔

تاجور نے پہلی بار وہاں کوئی ''مزاح کی بات'' کی تھی اور کسی کو ہنسی نہ بھی آ رہی ہو تو بھی ہنسنا لازم تھا۔ صرف چادر پھیلائے ہوئے اللہ وسائی تھی جو شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ اُس سے اُس دن سر ہی نہیں اٹھایا گیا تھا نہ اُس کی زبان سے کچھ نکلا تھا۔ وہ کچھ بولتی تو تو تلی کہلاتی اور سب اُس پر ہنستے۔ اللہ وسائی اُس دن سارا راستہ روتی آئی تھی۔

''میں نے آئندہ دانے لینے حویلی نہیں جانا گاموا!'' اُس نے گھر آتے ہی گاموکو سب کچھ کہہ سنایا تھا۔ اُس کا بھی دل برا ہوا تھا۔ لیکن اُس نے اللہ وسائی سے کہا تھا۔

''تجھے کتنی بار کہا ہے، وہ پیر صاحب کی بیٹی ہیں جن کے فیض سے ہمارا گھر آباد ہونے جا رہا ہے۔ چوہدری صاحب کی بہویں جن کے گھر سے آنے والے دانوں سے ہمارا چولہا جلتا ہے۔ تو دل میلا نہ کیا کر نہ برا مانا کر اُن کی بات کا۔ دیکھ نا، نہوں نے سارے پنڈ کو چھوڑ کر صرف تیرے ساتھ مذاق کیا۔'' گاموں نے جیسے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ پر اللہ وسائی اُس کی بات پر جیسے بلبلا اٹھی تھی۔

''اس گاؤں میں آج تک کبھی کسی نے مجھے تو تلی نہیں کہا۔ کبھی کوئی مجھ پر نہیں ہنسا۔ آج اُن کی وجہ سے گاؤں کی عورتیں ہنسی ہیں مجھ پر۔ کل وہ تو تلی تو تلی کہہ کر گلیوں میں بلائیں گی مجھے۔'' اللہ وسائی پھر رو پڑی تھی۔

''نہ رو اس طرح اللہ وسائی! جانے دے پیر صاحب کا احسان اتنا بڑا ہے کہ اُن کی بیٹی کو سات خون معاف ہیں۔ تو غصہ اور رونا چھوڑ۔ یہ دیکھ کیا لایا ہوں میں۔ گاموں نے اُس کا دل بہلاتے ہوئے ایک پوٹلی کھول کر اُس میں سے خوبصورت کپڑے نکالے

تھے جوایک ننھے بچے کے تھے۔اللہ وسائی یک دم رونا بھولی۔

''یہ کہاں سے لایا ہے تو؟'' جہاں سے بھی لایا ہوں۔تو یہ دیکھ ہیں کتنے سوہنے جب ہماری دہی یہ پہنے گی تو شہزادی لگے گی بالکل۔''

''ہاں روپ والی شہزادی.....میں کہتی ہوں تاجور بی بی جیسی سوہنی ہو پر ان جیسا غرور نہ ہو اس میں۔''

اللہ وسائی نے بے اختیار کہا تھا۔گاموسکرادیا تھا۔اللہ وسائی اب وہ ننھے ننھے رنگین کپڑے کھول کھول کر دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

گاموکی بھول تھی کہ اللہ وسائی سب بھول گئی تھی۔وہ اس دن کے بعد سے دوبارہ حویلی نہیں گئی تھی۔تب بھی نہیں جب مہینے کے بعد ہی تاجور کا پاؤں بھاری ہونے کی خبر گاؤں میں پھیلی تھی اور چوہدری کرامت نے اناج کی بوریاں ایک بار پھر کھول دی تھیں۔اس نے تاجور کے لیے دعا کی تھی لیکن اس سے جا کر ملی نہیں تھی اور تاجور کو بھی اس کا خیال نہیں آیا تھا۔

وہ حویلی کی اگلی نسل کو دنیا میں لانے میں اتنی مصروف تھی کہ اللہ وسائی کے ساتھ ساتھ گاموماشکی بھی اسے بھول گیا تھا۔

مراد ساتویں مہینے پیدا ہوا تھا اور قبل از وقت پیدا ہونے کے باوجود وہ صحت مند تھا اس کی پیدائش پر حویلی میں کئی ہفتے جشن کا سماں رہا تھا اور اسی جشن میں کسی نے تاجور کو اللہ وسائی کے ہاں پیدا ہونے والی بیٹی کی خبر دی تھی۔

''بی بی صاحبہ! گاؤں کی عورتیں کہہ رہی تھیں کہ اللہ وسائی کی دھی تو رنگ روپ میں آپ پر چلی گئی ہے۔وہ تو اللہ وسائی کی دہی لگتی دہی نہیں۔''

شکوراں نے اس دن تاجور کے بالوں میں تیل ڈال کر مالش کرتے ہوئے جیسے اس کے خنجر گھونپا تھا۔

''تجھے بات کرتے ہوئے لحاظ نہیں آتا۔کس کی اولاد کا رنگ روپ مجھ سے ملا رہی ہے۔'' تاجور خفا ہوئی تھی شکوراں گڑبڑائی۔

''نہیں نہیں بی بی صاحبہ! یہ میں تھوڑی کہہ رہی ہوں، یہ تو گاؤں کی عورتیں کہہ رہی ہیں۔میں نے تو خوب لڑائی کی ان عورتوں سے کہ نام بھی لے رہی ہیں تو حویلی کی بہو کا۔''

تاجور عجیب بے قراری سی اپنے سر کی مالش کرواتی رہی۔

''تو نے دیکھی ہے اس کی بیٹی؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے ایک دم پوچھا تھا۔

''نہیں بی بی صاحبہ! میں نے کہاں سے دیکھنا ہے۔آپ کہیں تو دیکھ کے آؤں؟'' شکوراں نے جھٹ تجسس سے کہا تھا۔

''ہاں.....جا دیکھ کر آ اور مبارک باد بھی دے آنا میری طرف سے۔''

تاجور کو بھی عجیب کریدسی ہوئی تھی اور شکوراں بے اختیار اس طرح خوش ہوئی جیسے اس کی دلی مراد پوری ہوئی ہو۔

گاؤں کی عورتیں فضول میں بک بک نہیں کر رہی تھیں۔شکوراں اللہ وسائی کی بیٹی پر پہلی نظر ڈالتے ہی دنگ رہ گئی تھی۔

دودھ جیسی رنگت اور گلابی ہونٹوں والی وہ بچی ہرنی جیسی آنکھیں کھولے کسی غزال کی معصومیت سے شکوراں کو دیکھ کر مسکرائی تو شکوراں کا دل بے اختیار پیار سے پگھلا تھا۔اسے وہ اپنی چھ مہینے کی بتول جیسی لگی تھی۔پر بتول اور اس میں ''روپ'' کا فرق تھا۔

''یہ تو تیری بیٹی لگتی ہی نہیں۔'' شکوراں اسے گود میں لیے کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی اور اللہ وسائی نے موتیا اس سے جھپٹ لی تھی۔

''میری نہیں تو اور کس کی بیٹی ہوگی۔چل جا یہاں سے۔'' وہ شکوراں سے خفا ہوگئی تھی جب سے موتیا اس کی زندگی میں آئی تھی۔اسے کسی کی پرواہ نہیں رہی تھی وہ اور گاموا ب اب موتیا کے گرد طواف کرتے رہتے تھے۔

☆☆☆

شکوراں نے واپس جا کر موتیا کا ویسا ہی نقشہ کھینچا تھا جیسا وہ دیکھ کے آئی تھی۔وہ نہ جھوٹ بول سکی تھی نہ اس کی کوئی خامی بیان کر پائی تھی۔تاجور نے ماتھے پر بل لیے اس کی بات سنی تھی اور پھر کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

اس کے بیٹے مراد کا گاؤں میں کہیں چرچا نہیں ہوا تھا روپ رنگ میں۔وہ صرف چوہدری شجاع کے بیٹے کے طور پر ہی یاد تھا سب کو لیکن جو قصیدے موتیا کے سننے میں آ رہے تھے۔وہ تاجور کو ہضم نہیں ہو پائے تھے۔

اللہ وسائی چھلہ نہا کر حویلی آئی تھی۔وہ پہلی بار تاجور کو مراد کی مبارک باد دینے آئی تھی اور تاجور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اندر بلانے پر مجبور ہوگئی تھی۔

''یہ کیا لائی ہو تو تلی؟'' تاجور نے جان بوجھ کر اسے اسی نام سے پکارا۔اللہ وسائی نے جیسے کان بند کر لیے تھے۔اس کے اندر اب غصہ رہا ہی نہیں تھا۔

''یہ گڑ ہے۔موتیا چھلے کی ہوئی ہے تو بانٹ رہے ہیں پورے گاؤں میں۔'' تاجور نے شکوراں کو اشارہ کیا تھا اور اس نے وہ گڑ پکڑ لیا تھا۔

''سنا ہے۔تمہاری بیٹی بڑی روپ والی ہے۔'' تاجور نے کچھ عجیب سے انداز میں اللہ وسائی سے کہا تھا۔اللہ وسائی کا چہرہ چمکا تھا۔

''شکر ہے رنگ روپ میں تجھ پر اور گامو پر نہیں چلی گئی۔''

تاجور نے عجیب کاٹ دار مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''ہاں جی.....رنگ روپ تو آپ کا لے آئی ہے چوہدرائن جی.....! میں جب بھی اپنے آپ کو دیکھتی تھی تو دعا کرتی تھی، اللہ اسے آپ جیسا رنگ روپ اور نصیب دے، میرے جیسا نہیں.....اللہ نے میری سن لی۔''

''اللہ وسائی کے جملوں نے تاجور کو عجیب طرح سے چٹخایا تھا۔

''نہ تمہاری بیٹی کا رنگ روپ میرے جیسا ہے اور نہ ہی نصیب میرے جیسا ہونا ہے، تو تلی! میں پیروں کی دھی ہوں چوہدریوں کی بہو۔ اور وہ کمی کمینوں، ماشکیوں کی اولاد کی وہ تنک کر بولی تھی۔

''دانے ڈال دے اسے شکوراں اس کے بھی اور اس کی بیٹی کے لیے بھی۔''

تاجور کہہ کر اٹھ گئی تھی پر جاتے جاتے اللہ وسائی کے منہ پر جیسے جوتا مار گئی تھی۔ شکوراں کو جیسے پہلی بار تاجور کے جملے اچھے نہیں لگے تھے۔

''چل تو دل پہ نہ لینا۔ یہ پیر اور سید غصے کے بڑے ڈھاڈے ہوتے ہیں پر، دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ تو لے جا یہ دانے۔ میں آؤں گی بتول کو لے کر کسی دن۔''

شکوراں نے تاجور کے جانے کے بعد بڑی مدھم آواز میں اس سے کہا تھا۔ اور پھر اسے دانوں سے بھرا ہوا تھیلا تھما دیا۔

اللہ وسائی ایک لفظ بھی بولے بغیر چلی گئی تھی۔ شکوراں اندر کمرے میں آئی۔

''بی بی صاحبہ! یہ گڑ کا کیا کرنا ہے؟'' اس نے اللہ وسائی کے لائے ہوئے گڑ کا پوچھا۔

''باہر پھینک دے۔ پتا نہیں کون کون سے ٹونے کر کے لے آتی ہیں عورتیں میٹھے پر۔'' تاجور نے مراد کو جھلاتے ہوئے کہا تھا۔

اس کے کانوں میں ابھی بھی اللہ وسائی کے جملے گھوم رہے تھے اور وہ یوں جھنجلا رہی تھی جیسے اللہ وسائی اس کا رنگ روپ اور نصیب چوری کر کے لے گئی تھی۔ اپنی بیٹی کے لیے۔

☆☆☆

سال بھر کی موتیا صحن میں چلنا سیکھ رہی تھی اور گاموا اور اللہ وسائی بیٹھے اسے دیکھتے ہوئے جیسے اس پر قربان جا رہے تھے۔

''دیکھ کیسے چلتی ہے میری موتیا اللہ وسائی! جیسے ہوا میں چل رہی ہو۔'' گامو نے کہا تھا اور پھر اپنی بات پر خود ہی ہنس پڑا۔

''تو نے بال دیکھے ہیں اس کے گامو..... ریشم ہے ریشم نہ تیرے بال ایسے ہیں نہ میرے..... یہ کہاں سے لے آئی یہ بال۔''

اللہ وسائی نے منجی کو پکڑ کر اس کے پاس آنے کی کوشش کرتی موتیا کو دیکھ کر کہا تھا، وہ اب اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

''تو رنگ روپ دیکھ، نین نقش دیکھ..... میری تو سات پشتوں میں کوئی ایسا نہیں ہے اللہ وسائی۔''

گامو ہر روز کی طرح آج بھی بیٹی کو دیکھتا اس کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔

نہ کہا کر ایسے گامو! نہ گنا کر میری موتیا کے نین نقش، نظر لگتی ہے۔

اللہ وسائی نے یک دم موتیا کو اٹھا کر گود میں لیتے ہوئے اوڑھنی ڈال کر جیسے اسے گامو کی نظر سے بھی چھپانے کی کوشش کی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہے تو..... تو روک دیا کر مجھے۔'' گامو نے فوراً ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا وہ اب اوڑھنی سے نکلنے کے لیے مچلتی ہوئی موتیا کو دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

''میں کیا کروں، مجھے خود بھی خیال نہیں رہتا۔'' اللہ وسائی نے ہنستے ہوئے موتیا کو ایک بار پھر آزاد کرتے ہوئے کہا۔

''تجھے پتا ہے گامو! میرا دل کیا کرتا ہے؟'' اس نے چارپائی سے اترتی موتیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' گامو نے جواباً پوچھا۔

''میں موتیا کو پڑھاؤں، لکھاؤں۔''

گامو نے حیرانی سے بیوی کو دیکھا۔ ''پڑھاؤں لکھاؤں؟''

''ہاں جیسے تاجور بی بی کو پڑھایا ہے پیر صاحب نے۔ میں سوچتی ہوں اسے وہ ڈاکٹرنی نہ بنا دیں جو کبھی کبھی گاؤں کی ڈسپنسری میں آتی ہے۔''

اللہ وسائی کے خوابوں پر کوئی قید ہی نہیں تھی۔

ہاں۔ ڈاکٹرنی بن جائے تو اچھا ہے پر تیرے میرے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں؟''

گامو نے سر کھجاتے ہوئے بیوی کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''تو جمع کر لیتے ہیں نا..... ابھی تو بڑا وقت پڑا ہے اس کے بڑے ہونے میں۔ تب تک جوڑ لیں گے اتنا پیسہ۔'' اللہ وسائی نے فوراً سے پیشتر کہا تھا۔

''ہاں پر پتا نہیں برادری والے کیا کہتے ہیں۔ گاؤں میں رواج کہاں ہے لڑکیوں کو پڑھانے کا۔'' گامو کو خیال آیا تھا۔

''رواج تو بنانے پڑتے ہیں گامو..... ہم ڈالیں گے رواج..... موتیا پڑھ لکھ کے ڈاکٹر بن گئی تو گاؤں کا ہی فائدہ ہے۔''

گاموا اس کی بات پر سر ہلانے لگا تھا۔

''ٹھیک کہتی ہے تو!''

میں سوچتی ہوں، بھٹی لگا لوں..... چار پیسے وہاں سے بھی آ جائیں گے۔''

اللہ وسائی اب ان کاموں کے بارے میں سوچنا شروع ہوئی تھی جو کر کے وہ اپنی کمائی بڑھا سکتی تھی۔

''اتنے سال تجھے بھٹی لگانے نہیں دی..... اب لگانے دوں۔'' گامو ملول ہوا۔

''تو کیا ہوا؟ اولاد کے لیے تو بڑا کچھ کرتا ہے انسان۔ یہ تو پھر بھٹی ہے۔''

اللہ وسائی نے ہنس کر کہا تھا۔ اس کی زبان میں تتلاہٹ تھی، سوچ میں کوئی تتلاہٹ نہیں تھی۔ وہ موتیا کو زمین پر نہیں آسمان پر دیکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

''ہے نا بابا جان خوب صورت میرا مراد۔'' ننھا مراد پیرابراہیم کے بستر میں سو رہا تھا اور پیرابراہیم اس پر آیات پڑھ پڑھ کر پھونک رہے تھے، جب تاجور نے ان سے کہا تھا۔ وہ رہنے کے لیے اپنے باپ کے گھر آئی تھی۔

''ماشاءاللہ، اللہ نظر بد سے ہمیشہ محفوظ رکھے پیرابراہیم نے مسکراتے ہوئے تاجور کو دیکھ کر کہا تھا۔

''بس۔'' آپ دعا کریں، میرے بھی سات بیٹے ہوں جیسے میرے سات بھائی ہیں۔''

تاجور نے باپ سے اصرار کیا تھا۔

''اللہ عطا کرنے والا ہے۔ اس کے خزانے میں کیا کمی ہے۔'' پیرابراہیم نے جواباً کہا تھا۔

''بابا جان! ویسے واقعی نصیبوں والی ہوں میں۔ پہلے ہی سال اللہ نے بیٹا دے دیا اور اس سال فصل بھی چار گنا ہوئی ہے، خوش بختی لائی ہوں میں حویلی کے لیے۔'' پیرابراہیم نے بیٹی کا پر تفاخر انداز دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے۔

''بار بار اپنی خوش قسمتی کو نہیں دہراتے تاجور! سارے انسان قسمت اور نصیب لے کر آتے ہیں بس ہمارے اعمال ہوتے ہیں جو ہمارے آگے آتے ہیں یا پھر آزمائشیں اور اللہ تعالیٰ آزمائشوں سے سب کو محفوظ رکھے۔'' وہ کہتے ہوئے تسبیح کرنے لگے۔

تاجور کو ان کی باتیں اچھی نہیں لگی تھیں۔

''بابا جان! میں وہ کہہ رہی ہوں جو جھوک جیون میں سب کی زبان پر ہے۔ جب سے میں وہاں گئی ہوں جھوک جیون کے کھیت لہلہانے لگے ہیں، بارشیں ہونے لگی ہیں۔ ورنہ آپ کو تو پتا ہے ابا جی کیسے ہر سال پریشان آیا کرتے تھے بارش کی دعا کرواتے۔''

تاجور نے جیسے باپ کو یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

''اللہ نے برکت ڈال دی، رحمت بھیج دی جھوک جیون میں۔ وہ صرف تمہاری وجہ سے تھوڑی ہوگا۔ پتا نہیں کتنے نیک لوگ ہوں گے وہاں دعائیں اور عبادتیں کرنے والے۔ پتا نہیں کس کی دعا لگی ہوگی۔ کس کی قبول ہوئی ہوگی۔'' تاجور اس بار خفا ہوگئی تھی۔

''ایک تو ابا جان آپ ہمیشہ مجھے ہی ٹوکتے ہیں۔''

پیرابراہیم ہنس پڑے اور انہوں نے کہا۔ ''اچھا یہ ساری باتیں چھوڑو، یحییٰ کا رشتہ طے کر دیا ہے میں نے۔''

انہوں نے بات بدلی تھی اور تاجور کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ اس کا بڑا بھائی تھا۔

''بھائی جان کا رشتہ؟ اور مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ میں نے لڑکی دیکھنے جانا تھا..... میں پسند کرتی پھر ہاں کرتے آپ۔

پیرابراہیم اس کی بات پر سنجیدہ ہو گئے تھے۔

''یہ رواج نہیں ڈالنا میں نے اپنے خاندان میں کہ لڑکیاں دیکھ دیکھ کر پسند یا ناپسند کریں۔ خاندان اچھا ہے بس تو اچھی رہے گی ہمارے گھر آ کر بھی۔'' پیرابراہیم نے جیسے بات ختم کی تھی۔

''بابا جان! رنگ روپ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ بھائی جان اتنے خوب صورت، اونچے لمبے ہیں اور آپ بغیر دیکھے کوئی بھی لڑکی لے آئیں گے ان کے لیے۔''

''تاجور کو باپ کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی اور پیرابراہیم اس کی بات پر یوں بنے تھے جیسے وہ انہیں بچوں کی باتیں لگی تھیں۔

''تاجور! تو نے کہاں سے سیکھ لی ہیں یہ ساری باتیں؟ ماں تیری ولی تھی اور باپ تیرا لوگوں کی خدمت کرنے والا اللہ کا بندہ..... تیرا نخرہ کس پر چلا گیا ہے؟'' انہوں نے ہنستے ہوئے تاجور سے کہا تھا۔

تاجور نے جیسے مزید برا مانا تھا۔ ''ٹھیک ہے بابا جان! آپ کریں جہاں بھی کر رہے ہیں بھائی جان کا رشتہ..... تاجور کو نہ پوچھیں۔ پر جب تاجور اپنے بیٹے کا رشتہ کرے گی نا تو چھان پھٹک کر دیکھ بھال کر کرے گی۔ ایسے ہی نیکیاں اور نسب دیکھ کر نہیں کر دے گی۔'' اس نے جیسے باپ کو سن لیا تھا۔

''کیا پتا مراد کے دل کو کیا بھا جائے پھر تو اس کے دل کا کیا کرے گی؟''

پیرابراہیم نے عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے پہلے مراد کو اور پھر تاجور کو ہنس کر دیکھا۔

''ماں کے دل سے بڑھ کر کوئی دل نہیں ہوگا اس کے لیے بابا جان۔'' تاجور نے جیسے بات ہی ختم کر دی تھی مراد اب ہلتے جلتے ہوئے جمائیاں لینے لگا تھا۔

پیرابراہیم بیٹی کو دیکھتے رہے۔

☆☆☆

وہ گاؤں کے اسکول میں موتیا کا پہلا دن تھا اور گاموا اور اللہ وسائی اسے خود چھوڑنے آئے تھے۔ وہ اس سرکاری اسکول میں لڑکوں کے ساتھ جانے والی پہلی لڑکی تھی اور اسکول کے پہلے ہی دن اس کا سامنا مراد سے ہوا تھا۔ جو چوہدری شجاع اور اپنے

ملازموں کے ساتھ اسکول آیا تھا۔اس کا بیگ ایک ملازم نے پکڑا ہوا تھا۔اس کے پانی کی بوتل دوسرے نے اور تیسرے نے اس کی کرسی اور میز جو تاجور نے شہر سے منگوائی تھی کیونکہ گاؤں کے اسکول میں ٹاٹ تھے۔

تاجور اور شجاع نہ چاہتے ہوئے بھی مراد کو گاؤں کے اسکول بھیجنے پر مجبور تھے وہاں وہ ایک ہی اسکول تھا اور آس پاس کے دیہات میں جو اسکول تھے،ان کا حال بھی ویسا ہی تھا۔وہ اسے شہر کے کسی بورڈنگ اسکول میں داخل کروانے کا جگرا نہیں رکھتے تھے۔کیونکہ مراد کے بعد تاجور کے ہاں ابھی تک کوئی اور اولاد نہیں ہوئی تھی۔

''ارے گاموا! تو کہاں جا رہا ہے؟'' شجاع نے گاموا اور اللہ وسائی کو موتیا کے ساتھ اسکول جاتے دیکھ کر جیسے کچھ حیران ہو کر پوچھا تھا۔

''چوہدری صاحب! موتیا کو بھی اسکول داخل کروا دیا ہے۔پڑھائیں گے اسے'' گاموں نے کہا تھا۔

چوہدری شجاع نے مسکراتے ہوئے بے حد حیرانی سے موتیا کو دیکھا اور جیسے دل ہی دل میں چشم بد دور کہا۔وہ بچی گاموا اور اللہ وسائی کے پاس کھڑی کسی ہیرے کی طرح دمک رہی تھی۔

''چلو،یہ تو بڑا اچھا ہے،گاؤں میں بھی لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج آئے۔''

چوہدری شجاع نے کہا تھا اور مراد کو اٹھائے ہوئے ملازم کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

پر مراد کی آنکھیں ملازم کی گود میں بھی بس موتیا پر ٹک گئی تھیں جو اس کے عقب میں اپنے ماں باپ کے ساتھ آ رہی تھی۔

بچپن معصوم ہوتا ہے،اسی لیے مومن ہوتا ہے اور حسن پرست بھی۔ننھا مراد اس لمحے میں موتیا کے ساتھ دوستی کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا اسے وہ ایسی ہی پیاری لگ رہی تھی۔

''میں نے اس کے ساتھ بیٹھنا ہے۔'' اس نے اندر کلاس میں ضد کی تھی موتیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو ٹاٹ کے ایک سرے پر سب لڑکوں سے الگ بیٹھی ہوئی تھی اور مراد کی کرسی اور میز ماسٹر کی کرسی اور میز کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔چوہدری شجاع نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں مانا تھا،اس کو موتیا کے ساتھ ہی بیٹھنا تھا اور وہ بالآخر کرسی سے اٹھ کر موتیا کے پاس ٹاٹ پر بیٹھ گیا تھا۔جتنا چہرہ مراد کا کھلا تھا اس سے زیادہ چمک موتیا کے چہرے پر آئی تھی۔

''دوستی؟'' ایک انگلی کو کنڈے کی طرح کرتے ہوئے موتیا کی طرف بڑھاتے ہوئے مراد نے اس سے پوچھا تھا۔موتیا نے اپنی انگلی کا کنڈا اس کی انگلی میں ڈالتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔مراد نے اپنی بوتل موتیا کے منہ کے ساتھ لگا دی تھی۔موتیا نے جھجکتے ہوئے پہلی بار حویلی کا وہ پانی پیا تھا جو اس کا باپ گاموہی وہاں پہنچا کر آتا تھا۔

وہاں کھڑے گاموں،اللہ وسائی،چوہدری شجاع اور اس کے ملازم ہونٹوں پر مسکراہٹیں لیے ہوئے یہ سب دیکھ رہے تھے۔وہ

بچوں کی دنیا تھی اور اس میں بس باغ ہی باغ ہوتے ہیں۔

ماسٹر صاحب نے پڑھانا شروع کیا تھا۔

پڑھو الف سے اللہ،جو سب کا ہے۔الف سے اللہ جو سب کا ہے۔

موتیا اور مراد بھی ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے پہلا سبق پڑھ رہے تھے۔موتیا مراد کو پہلے ہی دن زمین پر لے آئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

وہ ایک سانپ تھا۔تاریک رات کی طرح سیاہ،تارکول جیسی چمک لیے شاید چھ فٹ یا سات فٹ لمبا یا شاید اس سے بھی زیادہ ،اس کے جسم پر سیاہ رنگت میں بھی اس کی جلد کے نقش ونگاریوں نمایاں تھے جیسے کسی انسان کے تیکھے نقوش،اس کی گول چمک دار سیاہ آنکھیں جن میں ہیبت کے علاوہ کوئی تاثر نہیں تھا اور اس کا کسی تاج کی طرح تنا ہوا پھن جو اس کے کنڈلی مارے ہوئے وجود پر کسی چھتری کی طرح جھک جھک کر تنتا پھر کھڑا ہو جاتا۔

وہ اس جنگل میں کب سے اس کا پیچھا کر رہا تھا اور کیوں۔یہ اندازہ اسے نہیں ہوا تھا پر اس کے وجود کی سرسراہٹ اس کے کانوں میں کسی سیٹی کی گونج کی طرح چپکی ہوئی تھی۔

اس نے اسے بل کھاتے لہراتے،برق رفتاری سے اپنے پیچھے آتے بھی دیکھا تھا اور اب جب وہ ان درختوں کے بیچوں بیچ اپنے عقب میں آنے والے اس دشمن کا سامنا کرنے کے لیے رک گئی تھی تو وہ اپنا پھن اٹھائے کنڈلی مار کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ساکت تھے۔اس سانپ کو اگر اس کی آنکھوں میں خوف دیکھنے کی خواہش تھی تو اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔وہ خوف زدہ نہیں تھی اور پھر اس نے سانپ کے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سنی تھی،سانپ برق رفتاری سے پلٹا تھا اور اپنے عقب میں کھڑے اس مرد کو دیکھ کر پھنکارا تب ہی موتیا نے پہلی بار اس مرد کا چہرہ دیکھا اور وہ حیران رہ گئی تھی۔وہ وہاں بھی آ گیا تھا اور تب ہی اس نے سانپ کی کنڈلی کو آہستہ آہستہ کھلتے دیکھا۔

اس مرد کی نظر موتیا پر تھی۔وہ جیسے اس کے حسن سے مبہوت تھا۔موتیا نے اس سانپ کو اس مرد کے پیروں کی جانب جاتے دیکھا اور تب اس نے پہلی بار خوف محسوس کیا تھا اور تب ہی اسے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ وہ ناگن تھی۔کوبرا.....اس نے چلانا چاہا اور وہ چلا نہیں پائی۔وہ کوبرا اس مرد کے پیروں کے پاس پہنچ چکا تھا۔

موتیا ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی تھی۔وہ لرز رہی تھی اور اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔وہ آنکھیں کھول کر بھی جیسے خواب ہی دیکھ رہی تھی اور اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔صحن میں گاموا اور اللہ وسائی اس کے دائیں بائیں اپنی اپنی چارپائیوں پر رات کے اس

پچھلے پہر گہری نیند سو رہے تھے۔ دور کہیں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی تھی پتا نہیں وہ کتا تھا یا گیدڑ، موتیا نے جیسے عجیب سی کیفیت میں آواز سنی تھی۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جو گاموں کے گھر میں لگے ہوئے موتیا کے پھولوں سے مہکے ہوتے تھے انہوں نے اندھیرے میں چارپائی پر بیٹھی موتیا کو جیسے سہلایا تھا۔

موتیا ٹانگوں پر پڑے کھیس کو ہٹاتے ہوئے زمین پر کھڑی ہوگئی تھی۔ اپنی چپل کو پاؤں سے ٹٹولتے ہوئے اس نے ایک دم چپل پہننے کا ارادہ ترک کر دیا اس کی چپلوں کی آواز سے گاموا اور اللہ وسائی جاگ جاتے۔

ننگے پاؤں وہ صحن میں پڑے لکڑی کے اس اسٹینڈ کی طرف گئی تھی جس پر پانی کا ایک کچا مٹکا پڑا تھا اور مٹکے کے منہ کے گرد موتیا کے پھولوں کا ایک ہار لپٹا ہوا تھا جو اللہ وسائی صبح سویرے ہی پرو کر چڑھا دیتی موتیا نے گلاس اٹھا کر مٹکے منہ پر پڑا ڈھکن ہٹایا اور مٹکا جھکاتے ہوئے گلاس میں پانی بھرا اور پھر غٹا غٹ پی گئی۔ پانی نے جیسے اس کے اکھڑی ہوئی سانس بحال کی تھی پر اس کی نیند اڑ گئی تھی۔

گلاس واپس رکھ کے۔ موتیا نے سر اٹھا کر چودھویں کے چمکتے ہوئے چاند کو دیکھا جس کی روشنی نے اس کے گھر کے صحن کو عجیب سحر خیز چاندنی سے روشن کر رکھا تھا۔ اسی طرح دبے پاؤں وہ اپنی چارپائی کی طرف آ کر لیٹ گئی تھی۔

پورا آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور چاندان کے جھرمٹ میں کسی بادشاہ کی طرح لگ رہا تھا۔ بالکل گول، روشن، حسین وہ چاند پر نظریں جمائے اسے دیکھتی رہی۔ مگر اس کا ذہن وہیں اٹکا ہوا تھا۔ اس خواب میں نظر آنے والے مرد پر اور اس سانپ پر جو گن تھی۔

''پاگل ہے تو موتیا..... خوامخواہ فکر کرنے بیٹھ جاتی ہے۔ خواب ہے خواب..... نہ دنیا میں یہ مرد ہے نہ وہ سانپ۔ سو جاؤ۔''

اس نے ہمیشہ کی طرح زیر لب اس خواب کو بڑبڑاتے ہوئے جھٹلایا۔ پر آسمان پر نظر آنے والے اس خوب صورت چاند پر یک دم جیسے اسی مرد کا چہرہ ابھرنے لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں، ناک، مسکراتے ہوئے لب، اٹھی ہوئی ٹھوڑی، لمبی گردن۔

وہ عجیب حیرت سے چاند میں ابھرنے والی شباہت دیکھنے لگی۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر چاند میں ابھرنے والے اس چہرے کو جیسے چھونے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ چھو پائی تھی، موتیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں، چاند اب بھی وہ چہرہ بنا آسمان پر براجمان تھا اور تارے اسے اپنے جھرمٹ میں لیے ہوئے تھے۔ وہ آنکھیں کھولے آسمان پر چاند کو دیکھتی رہی اس چکور کی طرح جسے وہ اکثر رات کو اڑتے دیکھتی تھی۔

موتیا نے آسمان پر اس چاند کو دیکھتے ہوئے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ زیر لب ایک پھر دوسرا پھر تیسرا چوتھا، پانچواں، چھٹا اور

پھر وہ ساری سورتیں جو اس کو بچپن سے حفظ تھیں اور وہ آیات جو مسجد کے مولوی صاحب نے اسے رٹوائی تھیں پھر وہ سارے اسم الٰہی جنہیں اس نے اسم اعظم ڈھونڈنے کے لیے یاد کیا تھا۔ پھر وہ سارے اسم محمدؐ جو اس نے اس لیے رٹے تھے کیونکہ اللہ کے نام کے ساتھ نبیؐ کا نام نہ آئے یہ کیسے ممکن تھا۔

اور یہ سب پڑھتے پڑھتے وہ نیند کی وادی میں اترنے لگی تھی مگر وہ چہرہ اب بھی وہیں تھا، اس کے دل کے آسمان پر چاند بن کے بیٹھا ہوا، پر وہ ناگن وہ ناگن کیوں آ گئی تھی اس کے اور اس کے چاند کے بیچ۔

☆☆☆

کھل کے بہتے پانی میں ڈوبے موتیا کے خوب صورت پاؤں کسی جیولر کی دکان کے شیشے میں سجے ہیرے جواہرات جیسے لگ رہے تھے۔

بتول نے بڑی حسرت سے ان نازک دودھیا پاؤں کو دیکھا جن پر اس کی نظر ہمیشہ ہی اٹک جاتی تھی اور پھر اٹکی ہی رہتی تھی۔

''پھر کیا ہوا بتول؟'' موتیا نے اب ہاتھ سے کھل کا پانی مٹھی میں لے کر بتول پر پھینکا تھا اور جیسے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

وہ دونوں کنویں پر اس جگہ آ کر بیٹھی ہوئی تھیں جہاں گاؤں کی عورتیں کپڑے دھونے آتی تھیں۔ چلتے ہوئے ریٹ کھینچتے بیل دو وقت باری باری کنویں سے کھیتوں کے لیے پانی نکالتے تھے اور جب تک وہ ریٹ چلتا رہتا۔ عورتیں وقفے وقفے سے وہاں آ کر کپڑے دھوتی رہتیں۔

''کیا ہونا تھا؟'' بتول نے بھی جیسے بدلہ لیتے ہوئے پانی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں لے کر اس پر اچھالا تھا۔ ''سنا تو دیا تجھے سب کچھ۔''

وہ اب اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ بالٹی میں گیلے کپڑے اور پھر وہ ڈنڈا جو کپڑوں پر مار مار کے اس نے کھیس دھوئے تھے۔

''بڑا کمینہ ہوا پھر تو سعید۔'' موتیا نے جیسے برا مانتے ہوئے بتول سے کہا تھا جس نے کچھ دیر پہلے اسے اپنی اور سعید کے درمیان والی ملاقات کی کہانی سنائی تھی، سعید بتول کے چاچے کا بیٹا تھا اور دبئی میں کام کرتا تھا اور بتول اس پر مرتی تھی پر وہ ڈرپوک تھا اور ڈرپوک مرد سے پیار گلے میں پھانسی کے پھندے کی طرح ہوتا ہے۔ جس کا پیروں تلے سے تختہ نہ کھینچا گیا ہو۔

''نہیں، وہ کمینہ نہیں ہے، چاچا زیادہ کمینہ ہے۔ وہ بس ڈرپوک ہے۔'' بتول نے جیسے موتیا کو سعید کا مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''لو تو پھر پیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' موتیا قائل نہیں ہوئی تھی۔

''اس نے تھوڑی پیار کیا تھا۔ وہ تو میرا دماغ خراب ہوا تھا۔''

بتول نے بڑے اطمینان سے اسے بتایا۔ موتیا اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

''یعنی بس تو پیار کرتی ہے اتنے سالوں سے وہ نہیں کرتا؟''

اس نے جیسے مذاق اڑانے والے انداز میں بتول سے کہا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر موتیا کو دیکھا۔

''جب پہل عورت کی طرف سے ہوئی ہو نا تو پھر ساری عمر یہی سنتی رہتی ہے عورت کہ تجھے ہوا تھا نا پیار میں تو سمجھاتا تھا تجھے .....تو بس سعید پیار کر کے بھی اپنا پیار چھپاتا رہتا ہے۔''

موتیا کے سر کے اوپر سے اس کی باتیں گزر رہی تھیں۔

''تو پھر دفع کر سعید کو۔'' موتیا نے جیسے کچھ خفا ہو کر کہا بتول قہقہہ مار کر ہنسی۔

''پیار میں دفع کرنا ہی تو مشکل ہوتا ہے۔'' وہ اب اپنی قمیص کا گیلا دامن نچوڑ رہی تھی۔

''میں کرتی ہوں سعید سے بات اور اسے کہتی ہوں کہ یوں لارے نہ لگائے تجھے۔ آ کر کرے یا پار ماں باپ کو نہیں منا سکتا تو.....''

بتول نے موتیا کی بات بیچ میں کاٹی ''تو مجھے چھوڑ دے۔ یہ حل مجھے قابل قبول نہیں ہے موتیا اور تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتی۔ تو نے پیار نہیں کیا نا اس لیے۔

بتول اب اپنی بالٹی اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی جس میں کپڑے تھے۔

''میں نے ایسا پیار کرنا بھی نہیں ہے بتول جو مجھے خوار کر دے۔ تو پڑھ لکھ لیتی تو آج میرے ساتھ شہر میں ڈاکٹری پڑھتی دونوں سہیلیاں مزے سے اکٹھے آتی جاتیں ہر جگہ۔''

موتیا نے بھی اپنی بالٹی اٹھالی تھی۔ دونوں اب کنویں سے چل پڑی تھیں۔

''بتول کا دل نہیں لگتا موٹی موٹی کتابوں، میں شکر ہے میری ماں میرے پیچھے نہیں پڑی مجھے اس طرح پڑھانے کے لیے جس طرح چاچا گاموا اور چاچی تیرے پیچھے پڑے رہتے تھے۔'' بتول نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''وہ تھوڑی پیچھے پڑے رہتے تھے۔ یہ تو مجھے شوق تھا اور بس انہوں نے شوق پورا کر دیا میرا پڑھانے کا۔'' موتیا مسکراتے ہوئے اسے کہہ رہی تھی۔ وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گاؤں آئی تھی۔ وہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھی۔

''میں ویسے چلوں گی تیرے ساتھ کبھی شہر کے ہاسٹل اور تو مجھے شہر پھرا دینا سارا میں کبھی شہر نہیں گئی۔'' اس نے جیسے موتیا سے کہا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے اب کے واپس جاؤں گی تو میرے ساتھ ہی چلنا تم اور ہفتہ دس دن رہ کے آ جانا۔'' موتیا بھی فوراً اسے ساتھ

لے جانے پر تیار ہو گئی تھی۔

جھوک جیون میں شکوراں کی دھی بتول اس کی واحد سہیلی تھی جس کے ساتھ موتیا نے اپنا سارا بچپن گزارا تھا۔ وہ بتول سے ہر بات کہہ سن لیتی تھی اور یہی حال بتول کا بھی تھا۔ موتیا کے شہر جانے کے بعد بھی وہ جیسے اس کے واپس چھٹی پر آنے کے لیے دن گنتی رہتی تھی۔

وہ گاؤں کی ہر لڑکی کی طرح موتیا کے حسن پر مرتی تھی پر اس سے حسد نہیں کرتی تھی یا کم از کم بتول کو یہی لگتا تھا کہ اسے موتیا سے کبھی حسد نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اسے اس سے اتنا ہی پیار تھا۔

''اچھا سن تجھے اب بھی خواب میں وہ لڑکا نظر آتا ہے؟'' بتول کو یک دم موتیا کے خوابوں میں نظر آنے والا لڑکا یاد آیا۔ جس کا وہ کئی سالوں سے ذکر سنتی آ رہی تھی۔

موتیا نے چونک کر اسے دیکھا اور سر ہلایا۔ بتول کے چہرے پر اشتیاق آیا۔

''اچھا؟ اب کب آیا وہ خواب میں؟''

موتیا نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''رات کو۔''

بتول بے اختیار ہنسی اور اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''دو دن ہوئے ہیں تجھے واپس گاؤں آئے اور تو نے اسے پھر سے خواب میں دیکھ لیا۔''

وہ جیسے اسے چھیڑ رہی تھی مگر موتیا کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔

''اس بار میں نے خواب میں ایک سانپ بھی دیکھا بتول۔''

بتول اس کی بات پر چونکی تھی۔ ''سانپ؟''

موتیا نے سر ہلایا۔ ''ایک بہت لمبا، سیاہ، خوفناک سانپ کو برا تھا اور وہ اس لڑکے کے اور میرے بیچ کھڑا تھا۔ پھر وہ اس لڑکے کو کاٹنے گیا تھا اور میں ڈر گئی اور میری آنکھ کھل گئی۔''

بتول نے موتیا کا چہرہ دیکھا۔ اسے موتیا کے خوابوں پر عجیب سا اعتقاد تھا۔ وہ سچے خواب دیکھتی تھی اور جو بھی وہ خواب میں دیکھتی تھی وہ پورا ہوتا تھا اس کی گواہ خود بتول بھی تھی۔

''اللہ خیر کرے موتیا خواب تو اچھا نہیں۔'' اس نے جیسے فکر مند ہو کر کہا تھا۔

''ہاں برا خواب ہے میں جانتی ہوں اور مجھے خواب میں یوں بھی محسوس ہوا تھا جیسے وہ سانپ مادہ تھی۔ ناگن اور جب اس نے اس لڑکے کو کاٹا تو میں چیخ اٹھی تھی۔''

وہ اب بھی عجیب الجھے انداز میں اسے دھندلکے میں لیے اس خواب کے آخری لمحوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''تو صدقہ دے۔'' بتول نے بے اختیار کہا۔

''ہاں میں بھی صدقہ ہی دینے کا سوچ رہی ہوں پر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ صدقہ دوں کس کا؟ اپنا یا اس لڑکے کا؟''

وہ بڑبڑائی تھی اور بتول اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''مٹی کا ایک ذرہ تک نظر نہیں آنا چاہیے میرے مراد کے کمرے میں۔'' تاجور مراد کے کمرے میں کھڑی شکوراں ایک دوسری ملازمہ سے کمرے میں جھاڑ پونچھ کرواتے ہوئے ہدایات دے رہی تھی۔

''یہ سفید چادر کیوں ڈال دی ہے تو نے میرے بیٹے کے بستر پر وہ رنگلا کھیس نکال کر لا کڑھائی والا۔''

اس نے دوسری نوکرانی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ تھا جس نے مراد کے بستر پر سفید چادر ڈال دی تھی۔

''بس عقل ہی نہیں دی اسے رب نے..... لکھ بار سمجھا کے بھی کرنی اپنی مرضی ہی ہوتی ہے اس نے۔'' شکوراں نے بھی اس نوکرانی کو تاجور کی دیکھا دیکھی ڈانٹا تھا۔

تاجور کمرے پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ان دونوں سے مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی تھی۔

''چوہدری مراد کب آ رہا ہے؟'' تاجور کے جاتے ہی اس نوجوان ملازمہ نے بڑی بے قراری سے شکوراں سے پوچھا تھا۔

''دو دن بعد آ رہا ہے اور دیکھ یہ سرخی پاؤڈر کم کر کے آنا اب سے حویلی میں سنا تو نے۔''

شکوراں نے اسے بتاتے ہوئے ساتھ ہی ڈانٹنا ضروری سمجھا۔

''لے خالہ! بتول کو تو کبھی نہیں سمجھاتی میری سرخی پاؤڈر کے پیچھے پڑ گئی ہے تو۔''

اس ملازمہ نے جیسے ناراض ہو کر اسے ترکی بہ ترکی کہا تھا۔

شکوراں اسے گھور کر رہ گئی تھی اور پھر اس سے مزید بحث کیے بغیر وہ لپک کر کمرے سے یہ کہتے ہوئے نکل گئی۔

''چوہدرائن کو دیکھوں کوئی کام نہ ہوا نہیں۔''

باہر صحن میں تاجور صحن میں کھلی گندم کی بوریوں کو دیکھنے لگی تھی جنہیں کھولے گاؤں کی عورتیں پراتوں میں ہاتھ پھیر پھیر کر انہیں صاف کر رہی تھیں۔ وہ دانے صاف کرنے کے بعد انہیں بان کی چارپائیوں پر ڈال کر دھوتیں اور پھر دھوپ میں سوکھنے کے لیے چھوڑ دیتیں اور جب گندم سوکھ جاتی تو تاجور کی حویلی کے بڑے لے اس سے دوبارہ بھر کے قطار در قطار رکھ دیئے جاتے، وہاں موجود دانے پورا سال اگلی فصل آنے تک صرف حویلی کی مہمان داری کے کام نہیں آتے تھے بلکہ وقتاً فوقتاً پورے گاؤں میں بانٹے جاتے

تھے۔

گاؤں کی عورتیں گندم صاف کر کے دھونے پر بھی معاوضے کے طور پر ڈانے ہی لیتی تھی۔ تو اس گندم کو وہ اسی محبت سے صاف کرتی تھیں جیسے اپنے گھر کے دانے۔

''تھتھی نہیں آئی؟'' تاجور نے ایک نظر ان عورتوں پر ڈالتے ہی اللہ وسائی کو غائب دیکھا تھا۔

''آنا تو تھا اس نے چوہدرائن جی! پر وہ جب سے موتیا آئی ہے نا چھٹیاں گزارنے، اللہ وسائی کا دھیان کسی اور کام میں نہیں لگتا۔''

شکوراں نے اسے بتایا تھا اور تاجور چونکی تھی۔

''موتیا آئی ہوئی ہے؟''

''ہاں جی چوہدرائن جی! آپ کو سلام کرنے نہیں آئی؟ اسے تو دو تین دن ہو گئے ہیں۔''

شکوراں نے تاجور کو جیسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''پہلے کبھی لائی ہے اسے سلام کرانے جو اب لائے گی۔'' تاجور کے انداز میں عجیب کاٹ تھی ''بیٹی کو ڈاکٹر بنا رہی ہے تو دماغ ان دونوں کا خراب ہونے لگ گیا ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں چوہدرائن جی..... پر میں سمجھاؤں گی اسے کہ موتیا کو بھیجے آپ کے پاس۔'' شکوراں نے لقمہ دیا۔

☆☆☆

''ہاں اس سے کہنا دانہ چننے بھیجے بیٹی کو صرف ڈاکٹری سکھانی ہے اس نے.....؟ عورتوں والا کوئی کام نہیں سکھانا؟'' تاجور نے جیسے سلگ کر کہا تھا۔

''تو اور کیا ڈاکٹری بھی چوہدریوں کی مہربانی سے ہوئی ہے اس کی ورنہ، کہاں خرچے پورے ہونے تھے گاموسے اس کی پڑھائیوں کے۔ یہ تو چوہدرائن جی آپ اور چوہدری صاحب کے بڑے دل کی نشانیاں ہیں۔''

شکوراں کو ایک بار پھر موقع ملا تھا تاجور کو مکھن لگانے کا اور اس نے ہمیشہ کی طرح موقع ضائع نہیں کیا تھا۔

تاجور جیسے جھاگ کی طرح بیٹھی تھی وہاں پہ وہی تو تھے جنہوں نے موتیا کو پڑھایا تھا۔ ورنہ ان کے پلے کیا تھا اور اس احسان کی وجہ سے اللہ وسائی اس کے پیر پکڑتے نہ تھکتی تھی اور گاموپانی سے مٹی ہو گیا تھا ان کی چوکھٹ کی.....

اور بالکل اسی وقت باہر مردان خانے سے گاموکی ہوک بھری آواز گونجنے لگی تھی۔

دل دریا سمندروں ڈونگے

تے کون دلاں دیاں جانے ہو

(دل دریاؤں اور سمندروں سے گہرے ہوتے ہیں، دلوں کے راز کون جان سکتا ہے۔)

تاجور ٹھٹکی تھی۔ وہ گاموکی آواز پر اسی طرح ہمیشہ ٹھٹکتی تھی۔ ایک لمبا عرصہ اس نے حویلی کے مردان خانے میں اس کی آواز گونجنے نہیں دی تھی پر پھر چوہدری کرامت کی موت پر گاموایک بار پھر مردان خانے آ کر یہ کلام پڑھنے لگا تھا اور چوہدری شجاع کو اس کی آواز کسی ٹھنڈے پھاہے کی طرح لگنے لگی تھی۔ چوہدری کرامت کے چہلم تک گاموروز بلاناغہ آ کر مردان خانے میں سارا سارا دن بیٹھا چوہدری کرامت کے احسان اور نیکیاں گنتا روتا، حق باہو کا کلام پڑھتا رہا اور وہ چالیس دن تاجور کے اندر جو بھی آگ تھی وہ بھی ٹھنڈی ہی رہی۔ گاموبے ضرر تھا اس نے کیا لے جانا تھا اس حویلی سے اکھاڑ کے، تاجور نے جیسے خود کو سمجھا لیا تھا۔ گاؤں میں اب بھی موتیا کے نام کی بازگشت اڑتے اڑتے تاجور کے کانوں تک پہنچتی رہی پر وہ تکبر سے اسے جھٹکتی رہی۔

''گاموکو بھی رب سوہنے نے کیا ہی آواز دے کے بھیجا ہے۔'' شکوراں نے بھی وہاں دانہ چنتی دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھے گاموکو سراہا تھا۔

تاجور آج کل ایسی سرشار پھر رہی تھی کہ شکوراں گاموکے قصیدے بھی پڑھتی تو تاجور کو سنائی نہ دیتے۔ اس کے کان صرف مراد کی آہٹ پر لگے تھے۔ وہ لندن سے آنے والا تھا۔ ہر سال ایک بار آتا۔ اس بار سردیوں کے بجائے گرمیوں میں آ رہا تھا اور تاجور کا بس نہیں چل رہا تھا۔ وہ پوری حویلی بیٹے کے لیے سجا کر اس کا استقبال کرتی۔

''چوہدرائن جی! اس بار تو چھوٹے چوہدری کی شادی کر ہی دیں۔ یہ نہ ہو کہ گوروں کے ملک سے گوری لے آئے۔'' گندم صاف کرتی ایک عورت نے تاجور سے کہا تھا اور تاجور نخوت سے مسکرائی تھی۔

''میری اولاد ہے مراد، وہاں شادی کرے گا جہاں ماں کہے گی۔ گوروں کے ملک میں بیرسٹر بننے گیا ہے گوری ڈھونڈنے نہیں۔''

''تجھ کو بھی نذیراں! کبھی عقل نہیں آئی دیکھ کر تو بولا کر کس سے کیا کہہ رہی ہے؟'' شکوراں نے اس عورت کو جھڑکا تھا اور وہ عورت کچھ خفیف سی ہو کر چپ ہو گئی تھی۔

''میں نے تو اللہ وسائی کو بھی کہا ہے موتیا کا رشتہ ڈھونڈے یہ نہ ہو وہ شہر سے واپس نہ آئے۔'' ایک دوسری عورت نے لقمہ دیا

تھا اور موتیا کے نام پر لاشعوری طور پر تاجور کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

''پر موتیا سے تو نظر نہیں ہٹتی دیکھے میلی ہوتی ہے۔ رنگ روپ قد کاٹھ تو رانیوں جیسا لے کر پیدا ہوئی ہے اوپر سے ڈاکٹرنی بھی بن رہی ہے۔ اللہ وسائی کہتی ہے کسی اونچی جگہ رشتہ کرنا ہے اس نے موتیا کا۔''

وہاں بیٹھی عورتوں کو اب جیسے اپنا من پسند موضوع مل گیا تھا بات کرنے کے لیے اور وہ ایک کے بعد ایک لقمے دے رہی تھیں اور اپنے آپ کو پنکھا جھلتی تاجور نہ سننے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی سب سن رہی تھی۔ اس نے موتیا کو بس بچپن میں ایک بار دیکھا تھا پھر اس کے بعد کبھی نہیں، نہ اللہ وسائی اسے لائی تھی نہ تاجور نے موتیا کو کبھی بلایا تھا۔ پر اب وہ گاہے بہ گاہے اللہ وسائی کو یاد دلانے لگی تھی کہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح اسے بھی موتیا کو کام کاج کے لیے حویلی لانا چاہیے اور اللہ وسائی ہر بار اس کے سامنے ہاں کہہ کر وعدہ کر لیتی کہ اگلی بار موتیا آئے گی تو وہ اسے لے آئے گی، گندم صاف کرنے اور وہ اگلی بار کبھی نہیں آئی تھی۔

''اللہ وسائی نے دماغ خراب کر دیا ہوگا اپنی طرح بیٹی کا بھی ماشکی کی بیٹی اور اونچا گھر، ڈاکٹر بن رہی ہے تو بھی کیا ہے؟ تو کی کمین ہے۔'' تاجور نے عجیب نفرت اور حقارت سے سوچا تھا۔

''اور حسن ایسا بھی کیا حسن ہے کہ پورا گاؤں باتیں کرتا ہے۔ کسی دن بلا کے دیکھتی ہوں۔ یہ ہے کیا موتیا؟'' وہاں بیٹھے تاجور نے دل ہی دل میں طے کیا تھا۔

☆☆☆

آئینے کے سامنے کھڑی وہ اپنی آنکھوں میں سلائی بھر بھر کے سرمہ ڈال رہی تھی، جب اللہ وسائی اندر آئی تھی اور اس نے سجی سنوری بیٹی کو ایک نظر دیکھتے ہی اپنی نظر ہٹائی تھی۔ آگے بڑھ کے اس نے موتیا کی آنکھ سے ہی اپنی چھوٹی انگلی کی پور پہ سرمہ لگا کر موتیا کے گال پر نظر کا ٹیکہ لگا دیا تھا۔

''کیا کر رہی ہیں اماں! اتنی مشکل سے تیار ہوئی ہوں آپ نے پھر یہ ٹیکہ لگا دیا۔''

موتیا جھنجھلائی تھی اور اس نے گال رگڑنے کے لیے ہتھیلی بلند کی تھی پر اللہ وسائی نے کلائی پکڑ لی۔

''یہ نظر کا ٹیکہ ہے خبردار اسے ہٹایا تو نے! منع بھی کرتی ہوں نہ نکلا کر باہر اس کالے ٹیکے کے ساتھ بھی نظر نہیں ہٹتی تجھ سے موتیا۔''

اللہ وسائی فکرمند ہوئی تھی اور موتیا ماں کی پریشانی دیکھ کر ہنسی تھی۔

''اب کوئی ایسی بھی حور پری نہیں ہوں اماں۔'' اس نے لپ اسٹک ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

''نہ یہ ہونٹ لال کرنے کی کیا ضرورت ہے تجھے موتیا! چل صاف کر انہیں۔'' اللہ وسائی کا دل ہول گیا تھا۔ اس نے آج پہلی بار موتیا کو اس طرح ہار سنگھار کے ساتھ دیکھا تھا اور پہلی دفعہ ہی اسے اس کے جوان ہونے کا بھی احساس ہوا تھا۔

''اچھا اماں! ہٹا دیتی ہوں۔'' موتیا نے ماں سے بحث کرنے کے بجائے اپنی ہتھیلی ہونٹوں پر رگڑ کر جیسے ہونٹ پونچھے تھے اور پھر لپ اسٹک کی لالی کو ہتھیلیوں پر ہی رگڑ لیا تھا۔ اللہ وسائی کو پھر بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ لپ اسٹک کی پونچھنے کے بعد رہ جانے والی لالی موتیا کے ہونٹوں کو اور حسین کر رہی تھی۔

''یہ ٹیشن (اسٹیشن) پر جا کر بارات دیکھنا ضروری ہے۔ ادھر گاؤں میں ہی آنی ہے تیری سہیلی کی بارات تو پھر کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔'' اللہ وسائی کو اس کے اسٹیشن جانے پر اعتراض ہوا تھا۔

''اماں میری سہیلی کی بارات ہے پورا گاؤں جا رہا ہے اسٹیشن، میں کوئی اکیلی تھوڑی جا رہی ہوں۔''

اس سے پہلے کہ موتیا کچھ اور کہتی گاموا ندر آ گیا تھا۔

''چل جلدی کر موتیا! ٹانگے چل پڑتے ہیں پھر اتنی مشکل سے فیقے کو روک کے آیا ہوں۔'' گاموعجلت میں تھا۔

''آپ بھی چلیں اماں!'' موتیا نے اللہ وسائی کا ہاتھ پکڑا۔ اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

''نہ بس ٹھیک ہے تم دونوں باپ بیٹی ہی جاؤ مجھے بہتیرے کام ہیں پنڈ میں۔'' اللہ وسائی نے کہا اور پھر ساتھ ہی وہ گاموکو ہدایات دینے لگی۔

''دیکھو گاموجلدی لے کر آ جانا اسے واپس.....شام ہونے سے پہلے۔''

''ہاں ہاں اللہ وسائی! تو شام کی بات کر رہی ہے میں تو گھنٹے دو گھنٹے میں آ جاؤں گا واپس۔'' گاموں نے جیسے اسے تسلی دیتے ہوئے موتیا کو دیکھا اور نظر ہٹا لی۔

اس کی دھی کے چہرے پر ایسا ہی روپ تھا کہ گاموکی نظریں ٹھہر نہیں پائی تھیں۔ اسے پتا تھا اللہ وسائی کیوں اتنی بے چین ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے اتنے سالوں میں موتیا کو سیپ کے موتی کی طرح پالا تھا، جیسے کوئی مرغی اپنے انڈے اور پھر ان انڈوں سے نکلنے والے بچوں کو لے کر بیٹھتی تھی ویسے ہی گاموا ور اللہ وسائی موتیا کی چوکیداری کرتے تھے۔

ان کی بیٹی کے حسن کا چرچا گاؤں میں تھا اور قابلیت کے جھنڈے سات گاؤں میں گڑے ہوئے تھے۔

وہ جہاں سے گزرتی تھی، لوگوں کی نظریں روک لیتی تھی۔ وہ جس سے ملتی تھی اسے یاد رہ جاتی تھی۔ بچے بڑے، بوڑھے موتیا پر گاؤں کا گاؤں شیدا تھا۔ گاؤں کا بوڑھا موچی جو ایک سال کی عمر سے اس کے جوتے بنا رہا تھا اور اب اس کے جوتے مرمت کرتا تو سب سے پہلے مرمت کر کے بھیجتا۔

وہ گاؤں کی ڈاکٹر بیٹی تھی جس کے ہاتھ سے لوگوں کو شفا ملنے والی تھی، ویسی ہی شفا جو گاموں ماشکی کی مشک کے میٹھے پانی سے ہوتی تھی۔

گاؤں کا حلوائی، اب بھی اس کے مانگے بغیر بچپن کی طرح کاغذ کے ٹکڑے پر ایک جلیبی رکھ کے اسے پکڑا دیتا تھا اور بوڑھا ڈاکیہ اپنی سائیکل کچے راستے پر چلاتا دوڑاتا سب سے پہلے موتیا کے گھر کے دروازے پر ہی آ کر کھڑا ہوتا تھا کیونکہ جتنے کاغذ اور لفافے، اس نے اتنے سالوں میں موتیا کے گھر لا کر دیئے تھے وہ پورے پنڈ میں کہیں نہیں دیئے تھے۔

موتیا کسی کو چاچا کہتی، کسی کو ماما، کسی کو بابا جی، کسی کو تایا جی پر وہ ہر ایک سے رابطے میں تھی ہر کسی سے ملتی تھی۔ اور جب بھی وہ گاؤں آتی دوائیوں کا ڈھیر ساتھ لاتی جو وہ پورے گاؤں میں مفت بانٹتی پھرتی۔

وہ گاؤں کی ڈسپنسری میں بنا اجازت ہی بیٹھنے لگ گئی تھی۔ چند دن، چند ہفتے وہ جب بھی آتی روز ڈسپنسری میں بیٹھی، گاؤں کے لوگوں کا علاج معالجہ انہیں یہ بتا بتا کر کرتی کہ وہ ابھی ڈاکٹر نہیں ہے۔ اندازے سے ہی دوا دے رہی ہے۔

پر عجیب بات تھی۔ موتیا کا اندازہ کبھی غلط ہوا تھا نہ اس کی تشخیص، گاؤں کے لوگوں کو اس کے ہاتھ سے ابھی سے آرام آنے لگا تھا افاقہ ہونے لگا تھا گاموا ور اللہ وسائی اپنی بیٹی کی یہ تعریفیں سن کر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

انہوں نے ساری عمر دوسروں کے سامنے جھکتے گزاری تھی، اب وہ لوگوں کو موتیا کے سامنے جھکتے دیکھ رہے تھے وہ نہ پیر تھی نہ فقیر اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں جادو تھا پر اس کے ہاتھ میں شفا تھی اور برکت.....اور۔

یہ دونوں چیزیں کہاں سے آئی تھیں، اس کے لیے گاؤں والوں کو حساب کا کوئی کلیہ رٹنا نہیں پڑتا تھا۔

☆☆☆

ریل گاڑی چھک چھک کرتے ہوئے اس کے گاؤں کے قریبی اسٹیشن پر رکی تھی۔ مراد نے اپنا سامان اکٹھا کرنے سے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکا تھا۔ پلیٹ فارم پر زیادہ رش نہیں تھا اور ریل گاڑی آدھ گھنٹہ پہلے اسٹیشن پر پہنچ گئی تھی۔ کلائی میں بندھی گھڑی کے ڈائل پر ایک نظر ڈالتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا، جس کی اسے پریشانی ہوتی۔ وہاں اس

اسٹیشن پر اترنے کے لیے کھڑے ہونے والے مسافروں میں سے کوئی بھی پینٹ شرٹ میں ملبوس نہیں تھا۔

وہ سب شلوار قمیض ہی پہنے ہوئے تھے یا پھر لاچا کرتا، صرف وہ تھا جو اپنے حلیے اور رکھ رکھاؤ سے ویسا نہیں لگتا تھا اور اسی لیے وہ ریل گاڑی کے اندر سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ اپنا بیگ کندھے پر ڈالے سوٹ کیس دھکیلتے ہوئے ڈبے کے دروازے تک آ گیا تھا اور ڈبے کے کھلے دروازے سے، اس نے اس ٹھنڈی ہوا کو جیسے اپنی سانس کے ذریعے اپنے اندر اتارا تھا جو وہاں چل رہی تھی۔

بادل آسمان کو ڈھک رہے تھے اور پرندے نیچی پرواز کرتے ہوئے جیسے آنے والی بارش کا اعلان کر رہے تھے۔ شاید آس پاس کہیں بارش ہو رہی تھی، کیونکہ ہوا ٹھنڈی تھی اور نم بھی اور تر و تازہ کر دینے والی بھی۔

ڈبے کے دروازے میں کھڑے کھڑے اس نے پلیٹ فارم پر چوہدری شجاع یا اپنی حویلی کے کسی ملازم کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اپنے مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر یک دم ہی بھیڑ بڑھی تھی اس کے برابر والے ڈبے میں کوئی بارات تھی جو اب ریل گاڑی سے باجوں گاجوں سے لیس اتر رہی تھی اور پلیٹ فارم پر اس بارات کا استقبال کرنے کے لیے بہت سے لوگ تھے۔ ان لوگوں میں مراد کو عورتیں بھی نظر آ رہی تھیں جو اس کے ڈبے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دوسرے ڈبے کی طرف جا رہی تھیں۔

مراد وہیں کھڑا نیچے اترنے سے پہلے جیسے ان سب کے گزرنے کا انتظار کر رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا راستہ بند تھا۔

اپنے ڈبے کے سامنے سے گزرتے ہوئے لوگوں میں سے مراد نے موتیا کو جب دیکھا تھا، اس وقت وہ تیز ہوا کے جھونکے سے اپنے کرن لیے والے پیلے دوپٹے کو اپنے سر سے ہٹنے سے بچا رہی تھی اور جیسے اس دوپٹے میں لپٹی لپٹی جا رہی تھی۔ اس رو پہلی کرن والے دوپٹے نے اس کی آنکھوں سے ناک تک کو چھپا رکھا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ گھونگھٹ کاڑھے ہوتی تھی اور پھر ہوا کے ہلکے جھونکے نے جیسے اس گھونگھٹ کو اڑایا تھا اور تب مراد نے موتیا کا چہرہ دیکھا۔

ایک گال پر سرمے کے ادھ مٹے ٹیکے کی سیاہی لیے جھکی پلکوں والی آنکھیں، جو چہرے پر سرک کر اڑتے دوپٹے کے ساتھ کھلی تھیں اور انہوں نے مراد کے لیے حشر برپا کر دیا تھا۔ وہ جہاں سے آیا تھا وہاں حسن کا ہر نظارہ وہ کر کے آیا تھا۔ حسین اور سنگین! پر حسن پر کسی نے اس کی نگاہ کو اس طرح نہیں باندھا تھا جس طرح وہ ان چند لمحوں میں بندھی تھی۔ وہ لڑکی جو بھی تھی۔ پلیٹ فارم پر ان بہت سارے لوگوں کے جھرمٹ میں موتیے کا پھول لگ رہی تھی۔

مراد کو اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کے علاوہ کوئی اور تشبیہ ذہن میں نہیں آئی تھی۔

دوپٹہ اب اس کے ماتھے سے سر تک پہنچ کر اڑ گیا تھا اور اس کے بالوں کی لٹیں ہوا سے اڑنے لگی تھیں۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو سر سے اوپر لے جاتے ہوئے اڑ جانے والے دوپٹے کو پکڑنے کی جدوجہد میں مصروف تھی جب مراد نے اس کی کلائی میں پڑی دھنک رنگ چوڑیاں بھی دیکھی تھیں اور اس کے گال پر آسمان سے گرتی پہلی بوند بھی، وہ بدلیوں سے کسی دھنک کی طرح گھلی نظر آ رہی تھی اور گال پر گرتی پہلی بوند کے ساتھ موتیا نے سر سے اڑ جانے والے دوپٹے کو پکڑنے کی کوشش کی تھی، اور وہ اس میں ناکام رہی تھی۔

پھر اس نے سر اٹھا کر آسمان کو خوشی اور سرشاری کے ایک عجیب سے عالم میں دیکھا تھا۔ بارش کی اگلی بوند اس کے ہونٹوں پر ٹپ سے گری تھی اور جیسے اس نے گر کر اسے گدگدایا تھا اور موتیا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آئی تھی اپنا سر سیدھا کرتے ہوئے اس نے ریل گاڑی کے ڈبے کے دروازے میں کھڑے اس مرد کو دیکھا تھا، جو اسے مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا اور وہ ساکت ہو گئی تھی۔

ان دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ وہ اپنا کرن لیے والا دوپٹہ بھول گئی تھی۔ جواب اس کے چہرے سے اتر کر اس کے جسم کے گرد لپٹنا شروع ہو گیا تھا اور بارش کی بوندیں اس کے چہرے پر ایک کے بعد ایک گرنا شروع ہوئی تھیں پر موتیا جیسے کسی اور جہاں میں پہنچی ہوئی تھی۔

وہ یہاں کب تھی۔ وہ چہرہ جسے وہ خوابوں سے نکال کر آسمان کے چاند میں لے گئی تھی۔ وہ آج اس کے سامنے تھا۔ ریل گاڑی کے اس دروازے کے بیچوں بیچ ایستادہ اور موتیا کو رتی بھر کا شائبہ بھی نہیں تھا کہ یہ وہ نہیں تھا۔ وہ اس چہرے کے ہر نقش کو آنکھیں بند کر کے بھی کسی کاغذ پر اتار سکتی تھی اور یہاں تو وہ خود اس کے سامنے مجسم کھڑا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر، صرف چند ہی فٹ کے فاصلے پر اور اس کی نگاہ بھی اس پر ویسے ہی ٹھہری تھی جیسے موتیا کی، اس لمحے میں ان دونوں کے لیے، اس پلیٹ فارم سے سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔ آس پاس نظر آنے والے سارے لوگ، رہ گئے تھے تو صرف وہ دونوں، ہوا کے وہ اڑتے ہوئے جھونکے جو ان کے وجود کو سہلا رہے تھے اور بارش کے وہ قطرے جو ٹپ ٹپ کر کے گرتے ہوئے جیسے محبت کا استقبال کر رہے تھے جو وہاں دبے قدموں آئی تھی اور جسے سب سے پہلے بارش نے دیکھا تھا اور ہوا نے محسوس کیا تھا۔

''راستہ دینا بھائی!'' کسی نے مراد کو عقب سے ٹہوکا دیا تھا اور وہ ہڑبڑا کر پلٹا تھا وہ کوئی آدمی تھا جو ریل گاڑی سے اترنے کے لیے اپنے سامان اور خاندان کے ساتھ تھا۔ مراد نے پیچھے ہٹ کر انہیں نکلنے کے لیے راستہ دیا تھا اور وہ چند لمحے اس کے لیے بڑے بھاری تھے۔ وقت کا لمحہ، لمحہ میں ہی گھنٹے میں بدلا تھا اور گھنٹہ بھی صدیوں جیسا، وہ خاندان اپنے سامان سمیت گاڑی سے اتر گیا

تھا مراد لپک کر دوبارہ گاڑی کے دروازے میں آیا تھا۔ وہاں باہر کوئی نہیں تھا۔ مراد کو لگا تھا پوری دنیا میں جیسے کوئی تھا ہی نہیں اس ایک چہرے کے غائب ہونے نے جیسے مراد کے لیے ہر شے کو غائب کر دیا تھا۔ بے قراری کے عالم میں اس نے دروازے کے دائیں بائیں لگے ڈنڈوں کو پکڑتے ہوئے جیسے لٹک کر دائیں بائیں دیکھنے کی کوشش کی تھی وہ لڑکی کہیں نہیں تھی۔ وہ جیسے کسی وہم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے آئی تھی اور کسی خیال کی طرح پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی تھی۔ وہ لپک کر گاڑی سے اترا تھا اور اس نے جیسے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ یہاں وہاں ہر طرف، پر وہ یوں غائب ہوئی تھی۔ جیسے کبھی یہاں تھی ہی نہیں۔

''چھوٹے چوہدری صاحب! آپ کو کوئی لینے نہیں آیا؟'' وہ گاموتھا جو موتیا کو ڈھونڈنے آیا تھا اور موتیا کے بجائے مراد کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ مراد نے چونک کر گاموکو دیکھا تھا۔ گاموکو لگا وہ اسے نہیں پہچانا۔

''میں گاموماشکی حویلی میں پانی.....'' مراد نے اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔

''میں جانتا ہوں آپ کو چاچا گاموٹرین جلدی آ گئی اور ابھی شاید حویلی سے کوئی آیا ہی نہیں۔''

گاموں نے لپک کر برستی بارش میں اس کا سامان اٹھایا تھا۔ جو مراد نے پلیٹ فارم پر رکھا ہوا تھا۔

''تو پریشانی کس بات کی چھوٹے چوہدری صاحب! ابھی پہنچا دیتا ہے فیقا آپ کو حویلی۔'' مراد نے اس سے سامان لینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوا۔

''نہیں مجھے اٹھانے دیں۔'' وہ مراد کے روکنے کے باوجود رکا نہیں اور اسٹیشن کے باہر کھڑے کچھ تانگوں میں سے ایک تانگے کی طرف چلا گیا۔ فیقا بھی چوہدری مراد کو دیکھ کر اسی طرح نہال ہوا تھا جس طرح گاموں۔

''اگلی سیٹ پر بیٹھیں چھوٹے چوہدری اور دیکھیں آج فیقا کیسے حویلی پہنچاتا ہے آپ کو۔''

اس نے مراد کا سامان اگلی سیٹ پر رکھتے ہوئے کہا تھا مراد بھی تانگے کے اگلے حصے میں سوار ہو گیا تھا اور تب ہی گاموں نے دور بارش میں بھیگتی آتی بتول اور موتیا کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان لہرایا تھا۔ ان دونوں کے پاس پہنچنے پر اس نے ان دونوں سے کہا تھا۔

''کہاں غائب ہو گئی تم دونوں، بارات تو کب کی گاؤں چلی گئی یہ تو اللہ بھلا کرے فیقے کا میرے کہنے پر رکا ہوا ہے۔''

''چاچا! ریل گاڑی اندر سے دیکھنے کا شوق تھا۔ بس اسی میں دیر ہو گئی۔''

بتول نے کہا اور وہ دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر پر غور کیے بغیر پچھلے حصے میں سوار ہو گئی تھیں مراد فیقے سے باتوں میں

لگا ہوا تھا اس نے بھی عقب میں سوار ہونے والی لڑکیوں کو نہیں دیکھا تھا۔ دیکھ لیتا تو پتھر کا ہو جاتا۔

وہ لڑکی اس سے بس چند انچ دور اس کے عقب میں بیٹھی تھی تانگے کی پچھلی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے گاموبھی اب تانگے کے اگلے حصے میں سوار ہو گیا تھا وہ اور فیقا اب مراد کو گاؤں کے بارے میں بتا رہے تھے اور تانگہ آگے بڑھ گیا تھا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھی موتیا گم صم بیٹھی ریلوے اسٹیشن کی دور ہوتی ہوئی عمارت کو دیکھ رہی تھی اور ساتھ اس ریل گاڑی کو بھی جو بارش میں دھواں اڑاتی چھکا چھک کرتی اب اسٹیشن سے کسی اگلی منزل کے لیے نکل گئی تھی۔

''تجھے کیا ہوا؟ تو کیوں گم صم ہے کب سے؟'' بتول نے سرگوشی میں موتیا سے کہا تھا اسے اندازہ تھا کہ اگلی سیٹ پر کوئی مرد بیٹھا تھا جسے وہ نہیں جانتی تھی اور پھر یک دم اس نے سرگوشی میں موتیا سے کہا۔

''ہائے اللہ یہ تو چھوٹا چوہدری ہے۔ جو اگلی سیٹ پر بیٹھا ہے پلٹ کر دیکھ موتیا کتنا سوہنا ہے۔''

بتول نے اس کا ہاتھ دبا کر اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا تھا۔ موتیا نے گردن تک نہیں موڑی اور اسی مدھم سرگوشی میں اس سے کہا۔

''سوہنا تو وہ ہے جسے میں خوابوں میں دیکھتی ہوں۔''

بتول جھلائی تھی۔ وہ اس کے خوابوں سے بھی واقف تھی اور اس میں نظر آنے والے لڑکے کے بارے میں بھی جانتی تھی۔

''وہ خواب ہے یہ تو ساتھ بیٹھا ہے دیکھ تو سہی۔''

اس نے موتیا کا ہاتھ دبایا تھا، موتیا نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس سے کہا۔

''وہ بھی خواب نہیں ہے۔'' بتول نے اس کی بات پر غور نہیں کیا تھا اس کا دھیان اب صرف چوہدری مراد پر تھا جو گاموا اور فیقے سے گاؤں کے کھیتوں، کھلیانوں، باغوں، مویشی اور پتا نہیں کس کس چیز کی بات کر رہا تھا اور بات کرنے سے بھی زیادہ وہ گاموا اور فیقے کی باتیں سن رہا تھا۔

برستی بارش میں تانگہ بالآخر حویلی کے سامنے جا کر رکا تھا۔ مراد نے تانگ سے اترنے سے پہلے اپنی جیب سے بٹوہ نکال کر فیقے کو چند نوٹ دینے چاہے اور فیقے کو جیسے کرنٹ لگ گیا تھا۔

''چھوٹے چوہدری سے کرایہ کیسے لے سکتا ہوں جی میں؟''

''تمہارے لیے نہیں گھوڑے کے لیے دے رہا ہوں تم تو واقعی نہیں لے سکتے۔''

مرادخوش دلی سے کہتے ہوئے نوٹ اس کی مٹھی میں دبا کر اتر گیا تھا۔گاموپہلے ہی اس کا سوٹ کیس پکڑے کھڑا تھا۔

''نہیں چاچا!اب نہیں اب میں خود لے جاؤں گا اندر۔''اس نے گاموکے نا چاہنے کے باوجود اس کے ہاتھ سے وہ سوٹ کیس پکڑ لیا تھا۔گامونانگے پر دوبارہ بیٹھ گیا تھا اور فیقے نے تانگہ آگے بڑھا دیا تھا اور تب اندر حویلی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے مراد نے پہلی بار دور جاتے تانگے کے پچھلے حصے کو دیکھا تھا اور وہ قدم اٹھا نہیں سکا۔جس لڑکی کے بارے میں وہ پورا راستہ سوچتا آیا تھا۔

وہ اس کے عقب میں اسی تانگے پر بیٹھی ہوئی تھی جس پر وہ گاؤں آیا تھا۔وہ گردن موڑے پلکیں جھپکائے بغیر موتیا کو دیکھے جا رہا تھا اور یہی حال موتیا کا تھا۔وہ بتول تھی جو پلیٹ فارم پر اس کی کلائی پکڑ کر اس کو دوسرے ڈبے کی طرف لے گئی تھی اور پھر موتیا اس چہرے کو ڈھونڈتی رہ گئی تھی جسے وہ کئی سالوں سے اپنے خوابوں میں دیکھتی آ رہی تھی اور اب ایک بار پھر اس چہرے کو تانگے کی رفتار اس سے دور کر رہی تھی۔پر اس بار وہ اس چہرے کا نام جان چکی تھی۔

''یہ مراد ہے؟''دور کھڑے بارش میں بھیگتے مراد پر نظریں جمائے عجیب سی کیفیت میں موتیا نے بتول سے پوچھا تھا۔بتول نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر مراد کو جوان کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے کہا تھا۔

''چوہدری مراد۔''وہ اب موتیا کا چہرہ دیکھ رہی تھی پھر دور بارش میں بھیگتے مراد کو پھر موتیا کو جس کے ہونٹوں پر ایک عجیب والہانہ مسکراہٹ تھی۔

''یہ وہی ہے بتول.....جو میرے خوابوں میں آتا ہے۔''

بتول کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔اس نے گردن موڑ کر ایک بار پھر مراد کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔وہ دیکھ نہیں پائی حویلی بہت دور رہ گئی تھی اور بارش بہت تیز تھی پر اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس بارش میں بھی مراد وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔بتول نے موتیا کا چہرہ دیکھا'وہ اب بھی دور مراد کو دیکھ رہی تھی۔فاصلہ اور بارش جیسے دونوں غائب ہو گئے تھے'وہ اسے اب بھی دیکھ پا رہی تھی اپنی ہتھیلی کی طرح۔

''چوہدری مراد؟''بتول نے بے یقینی سے دہرایا تھا یوں جیسے یہ یقین چاہتی ہو کہ اسے غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔

''مراد۔''موتیا نے جواباً دہرایا تھا۔

☆☆☆

ابا ابا مینہ ورسا

سب دی جھولی دانے پا

سب کجھ کریں کراویں آپ

تو رب ساری دنیا دا

''موتیا پاگل ہو گئی ہے'بارش میں کھڑی ہے'سارے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔شادی پر پہننے والا جوڑا ہے۔''

اللہ وسائی کمرے سے کچھ لے کر نکلی تھی۔جب اس نے صحن کے بیچوں بیچ برستی بارش میں کھڑی موتیا کو دیکھا تھا۔وہ کب آ کر وہاں کھڑی ہوئی تھی اللہ وسائی کو پتا نہیں چلا تھا پر وہ اب ننگے پاؤں صحن کے بیچوں بیچ کھڑی برستی بارش میں سر اٹھا کر جیسے آسماں کو دیکھ رہی تھی'اسے نہ دوپٹے کا ہوش تھا نہ چپل کا'نہ اس گوٹے والے جوڑے کا جواب بھیگ کر اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا۔اس نے اللہ وسائی کی آواز پر سر نیچے کر کے ماں کو دیکھا تھا جو برآمدے میں کھڑی تھی۔موتیا کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آئی پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ماں کی طرف آئی۔

''اماں خواب میں کسی کو دیکھیں اور وہ سامنے آ جائے تو کیا ہوتا ہے؟''اللہ وسائی اس کے سوال پر حیران ہوئی تھی۔

''کیا ہوتا ہے؟''اس نے الجھے ہوئے لہجے میں موتیا سے جواباً پوچھا تھا۔

''یہ تو آپ سے پوچھ رہی ہوں۔''

اللہ وسائی اور الجھی''تو نے کس کو دیکھ لیا موتیا؟''

''مراد کو۔''اس نے عجیب مسکراہٹ کے ساتھ ماں کو بتایا جیسے بچپن میں گھر کے موتیے کے پودوں میں جگنو ڈھونڈھ لینے پر ماں کو بتاتی تھی۔اس کی آنکھیں بارش کے پانی سے بھری ہوئیں ہیرے کی کنیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔اللہ وسائی کی سمجھ میں نہیں آیا وہ بیٹی کو کہاں کہاں کا لاٹیکہ لگاتی پھرے۔

اس نے موتیا سے نظریں ہٹا کر منہ ہی منہ میں ماشاءاللہ کہا تھا پر وہ سمجھ نہ پائی کہ وہ کس مراد کی بات کر رہی تھی اور پھر جیسے بجلی کے جھماکے کے ساتھ اللہ وسائی کو یاد آیا تھا۔

''چوہدریوں کے بیٹے کی بات کر رہی ہے؟''اس نے بے یقینی سے بیٹی سے پوچھا۔

موتیا نے کھڑے کھڑے سر ہلایا۔''وہ وہی ہے اماں!جسے میں خوابوں میں دیکھتی تھی۔آج اسٹیشن پر بھی دیکھ لیا۔''

اللہ وسائی گنگ ہو گئی تھی۔موتیا کے چہرے اور آنکھوں میں اس نے مراد کے نام پر جو دیکھا تھا اس نے اسے بت بنا دیا تھا۔

''بس دوبارہ نام مت لینا اس کا۔ پی جا اس کا نام۔'' اس نے زندگی میں پہلی بار موتیا کو ڈانٹ والے انداز میں کہا تھا۔

موتیا نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور اپنا منہ کھول دیا۔ برستی بارش کے قطرے اب سیدھا اس کے منہ میں اتر رہے تھے اور وہ کسی بچے کی طرح ان قطروں کو ہونٹوں سے ہوا میں پکڑتے ہوئے حلق سے اتار رہی تھی۔ پھر اس نے ماں کو دیکھا مسکرائی۔

''پی گئی اس کا نام۔''

اللہ وسائی ہل ہی نہیں پائی وہ شرارت نہیں کر رہی تھی فرمائش کر رہی تھی اور جو طلب کر رہی تھی۔ وہ اس کی اوقات سے کہیں بڑھ کر تھا۔

ابا ابا مینہ برسا

سب دی جھولی دانے پا

سب کچھ کریں کراویں آپ

تو رب ساری دنیا دا

باہر گلی میں بچے نمانے ننگے پاؤں پانی میں بھاگتے ہوئے بلند آواز میں باجماعت گا رہے تھے۔ اندر صحن میں بارش میں بھیگتی موتیا ان کے پیچھے وہی گاتے اور دہراتے ہوئے صحن میں بازو پھیلائے گول چکر کاٹ رہی تھی۔ یوں جیسے وہ بارش برسانے والے بادل پر پاؤں رکھے ہوا میں تیر رہی تھی۔

بس اک لمحہ ہوتا ہے میں سے تو ہونے میں اور تو سے کل کائنات ہو جانے میں' وہ لمحہ نہ دستک دے کر آتا ہے نہ چٹھی بھیج کر۔ وہ ہوا کی طرح آتا ہے اور آندھی بن جاتا ہے۔ بارش کی طرح آتا ہے پاؤں میں بھنور باندھ جاتا ہے۔

☆☆☆

''ٹھہر مراد! اندر بعد میں جانا پہلے تیری نظر اتار دوں شکوراں' جا مرچیں لے کے آ مراد سے واروں۔''

بارش میں بھیگے ہوئے مراد کو گلے لگا کر چمٹائے رکھنے کے بعد الگ کرتے ہی تاجور نے سب سے پہلے شکوراں کو آواز دی۔ تھی۔ مراد ماں کی بات پر ہنسا تھا۔

''بارش میں بھیگتا آیا ہوں مجھے کس کی نظر لگے گی۔''

''لے تجھے کیا پتا بارش تھوڑی ڈھال بنتی ہے کسی کی بری نظر کے سامنے اور اس گاؤں میں تیرے جیسا سوہنا گھبرو جوان ہے

کون کہ لوگ مڑ مڑ کے نہ دیکھیں۔''

تاجور نے مراد کے چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد و قامت کو دیکھتے ہوئے جیسے منہ ہی منہ میں اس پر پتا نہیں کیا کیا پھونکا تھا۔ وہ ہر سال گاؤں آتا اور ہر سال ہی پہلے سے زیادہ اونچا لمبا لگتا پر اس سال تو پہلی بار وہ مرد لگنے لگا تھا اس کا دبلا پتلا جسم یکدم ہی بھر گیا تھا اور کسرتی نظر آنے لگا تھا۔ وہ اس ویٹ لفٹنگ کا نتیجہ تھا جو اس نے کچھ عرصے پہلے ہی شروع کی تھی۔

شکوراں لپک کر مرچیں لائی تھی، جو تاجور نے پتا نہیں کیا پڑھ پڑھ کر مراد کے سر سے واری تھیں۔

''جا..... جا کے کوئلوں پر ڈال کر جلا۔ ساری بری نظریں، ساری بلائیں جل کر بھسم ہو جائیں۔'' تاجور نے مرچیں شکوراں کو دیتے ہوئے کہا' مراد ہنسا۔

''ایسا تو کوئی ہے ہی نہیں جس نے آپ کے بیٹے کو دیکھا ہو۔''

یہ جملہ کہتے ہوئے مراد کے ذہن پر ایک جھماکے کے ساتھ موتیا لہرائی تھی۔ اس کی وہ ہرنی جیسی آنکھیں جو اس پر ٹکی تھیں اور اسے گھائل کر گئی تھیں۔ پر وہ بری نظر کہاں تھی اس کے لیے وہ تو وہ نظر تھی جس کے لیے وہ جاگیریں دے سکتا تھا۔

''نہ پتر! اب یہ نہ کہنا مجھے کہ تو سامنے آئے اور کسی کی نظر نہ پڑے۔'' تاجور نے اس کی بات کو بڑے یقین سے جھٹلایا تھا۔

''تیرے ابا جی کو کب سے کہہ رہی تھی۔ وقت سے پہلے نکل جائیں تجھے لینے اور اب دیکھ تو یہاں کھڑا ہے اور وہ اسٹیشن پر تجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔'' تاجور اس کا بازو پکڑے اسے اندر لے جاتے ہوئے بولی تھی۔

''بس ہر سال میری گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ آتی تھی اس بار آدھ گھنٹہ پہلے آ گئی تو ابا جی سے اندازے کی غلطی ہو گئی۔'' مراد نے ہنستے ہوئے ماں سے کہا تھا۔

''پر دیکھ نا تو بھٹک گیا ہے پتا نہیں کتنی مشکل سے پہنچا ہے' جا کپڑے بدل پھر میں تیرے لیے کھانا لگواؤں تیرے ابا بھی پہنچ جائیں گے تب تک۔''

تاجور نے مراد سے کہا تھا اور وہ اپنے کمرے کی طرف چلا آیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور وہ ایک بار پھر حویلی کے باہر اس برستی بارش میں پہنچ گیا تھا جہاں اس نے ٹانگے کے پیچھے موتیا کو دوسری بار دیکھا تھا اور اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کاش وہ کچھ اور مانگ لیتا۔ وہ موتیا ہی مانگتا خوشی اور سرشاری کی وہ کیفیت تعجب اور معجزے سے گندھی ہوئی تھی۔ وہ جسے ریلوے اسٹیشن پر کھو بیٹھا تھا۔ اسے اپنے گھر کے باہر ڈھونڈ نکالا تھا اور وہ اسی کے گاؤں کی لڑکی تھی اطمینان یہ تھا کہ وہ

اس کو کھوج لے گا وہ جہاں بھی رہتی تھی جو بھی تھی۔

اس کے نین غزالی دلبر

اس کے گال گلابی

اس کے روپ پہ ساون برسے

بہہ جائے مرمر کے

اس کا حسن کہانی جیسا

کاغذ کتنے بھر دے

اس کی مشک بہاروں جیسی

اس کی چپ میں چھاؤں

وہ حسن پری

وہ روپ متی

وہ میرے جل کی ناؤ

مراد زیرلب وہ سارے بول دہرا رہا تھا جو اس نے ریل گاڑی میں گڑوی بجا کر اپنی کسی ان دیکھی محبوبہ کے لیے قصیدے گاتے ہوئے کسی گانے والے سے سنے تھے جو لمبی تان لگاتا، گڑوی بجاتا ریل گاڑی کے اندر بیٹھے مسافروں کے پاس سے گزرتا گا رہا تھا اور مراد حسن کے ان سارے قلابوں کو سنتے ہوئے محظوظ ہو رہا تھا جو وہ گانے والا ملا رہا تھا۔ اس نے کچھ روپے اس کی گڑوی میں ڈالے تھے جب اس نے گڑوی اس کی طرف بڑھائی تھی اور باقی لوگوں میں سے کسی نے ایک سکہ کسی نے دو سکے اور شاید یہ مراد کے دیئے گئے نوٹوں کا اثر تھا کہ وہ اس کے پاس کھڑا گڑوی بجاتا دوبارہ اپنی محبوبہ کا قصیدہ پڑھتا رہا اور مراد مسکراتا ہوا سنتا ہوا یہ سوچتا رہا تھا کہ دنیا میں ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی عورت کا حسن کسی مرد کو اس طرح گانے پر مجبور کر دے اور پتا نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جس میں یہ طے ہوا تھا کہ اس کے سوال کا جواب اسے اگلے ایک گھنٹہ میں ہی مل جانا تھا۔

اور اب وہ اپنے کمرے میں کھڑا اس ایک ایک بول کو دہرانا۔ موتیا کو اپنے تصور کے آئینے پر لفظوں سے کھینچ رہا تھا۔

وہ حسن پری

وہ روپ متی

وہ میرے جل کی ناؤ

وہ کمرے کے فرش پر ننگے پاؤں کھڑا تھا اور اس کے پیروں کے گرد وہ پانی تھا جو اس کے کپڑوں سے نچڑ کر فرش پر پھیل رہا تھا اور مراد ہلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ بس ہمیشہ کے لیے ایسے ہی کھڑا رہ جانا چاہتا تھا اس کے لیے گیت گاتے ہوئے جس کو ایک بار پھر دیکھنے کی تمنا اسے چکور بنا رہی تھی۔

باورچی خانے کے مٹی کے چولہے میں دہکتے کوئلوں پر شکوراں مرچیں ڈال رہی تھی اور مرچوں سے اٹھتا دھواں دیکھتے ہوئے تاجور کو عجیب سکون ہوا تھا۔ ''ہر بری نظر مراد سے سو کوس دور ہر بلا اس کے بیٹے سے پرے۔'' وہ زیرلب کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

بتول نے اپنی بندھی ہوئی گیلی چٹیا کھولنا شروع کر دی تھی اس کا ذہن موتیا کے اس ایک جملے میں ہی الجھا ہوا تھا۔

''یہ وہی لڑکا ہے جسے میں خوابوں میں دیکھتی ہوں۔''

بتول حیران تھی۔ اس نے درجنوں بار موتیا سے اس کے خواب سنے تھے اور ان خوابوں میں نظر آنے والے لڑکے کا حلیہ بھی کرید کرید کر پوچھا تھا لیکن ایسا کیوں ہوا تھا کہ اس کا دھیان کبھی چوہدری مراد کی طرف نہیں گیا تھا۔ چوہدری مراد سے بتول کا بہت کم آمنا سامنا ہوا تھا وہ جب بھی پاکستان آتا حویلی میں بہت کم ہی ٹھہرتا وہ اور تاجور اور چوہدری شجاع سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے تھے پر پھر بھی حویلی میں جگہ جگہ مراد کی تصویریں تھیں۔

بتول کو کبھی چوہدری مراد کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ یہ سوال بتول اب اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی اور جواب اس کے پاس تھا وہ گاموماشکی کی دھی موتیا تھی خوابوں میں بھی چوہدریوں کا بیٹا کیسے آسکتا تھا اور پھر موتیا تو کبھی حویلی بھی نہیں گئی تھی بچپن کے علاوہ مراد اور اس کا کبھی آمنا سامنا بھی نہیں ہوا تھا پھر بتول کیسے یہ سوچتی کہ وہ مراد بھی تو ہو سکتا تھا۔ اس نے گاؤں کے ہر ہر لڑکے کے چہرے پر موتیا کے خوابوں والے لڑکے کا چہرہ رکھ کر نا پا تھا اور ہر بار اسے مایوسی ہی ہوتی تھی۔

سوال یہ نہیں تھا کہ آخر موتیا نے مراد کو بغیر دیکھے خوابوں میں کیسے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ مراد اسے اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس برستی بارش میں کھڑا دیکھتا رہا تھا۔

وہ مرد کی نظر پہچانتی تھی کیونکہ جس نظر سے مراد نے موتیا کو دیکھا تھا اس نظر کے لیے بتول ساری عمر ترسی تھی۔ وہ جس سے پیار

کرتی تھی اس کے پاس محبوب کی نظر ہی نہیں تھی اور آج بتول نے دیکھی تھی تو وہ تھاہ ہی مر گئی۔

''تو موتیا تو کتنی خوش نصیب ہے کہ جو بھی تجھے دیکھتا ہے تجھ پر مر ہی جاتا ہے۔''

بتول نے عجیب حسرت سے چٹیا کا آخری بل کھولتے ہوئے سوچا تھا اور ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ موتیا روپ والی تھی اور وہ بس روپ والی کی سہیلی تھی' موتیا نصیب والی تھی اور وہ بس اس کی سکھی' موتیا کے چرچے ہوتے تھے اور وہ بس سننے والوں میں سے ایک تھی۔

وہ موتیا سے حسد کرنا چاہتی تھی۔ رج کے حسد.....وہ بھی نہیں ہو پاتا تھا کیونکہ وہ نیک تھی اس کی نیکیاں بتول کا زہر پی جاتی تھیں جیسے منکا زہر پیتا ہے اور پھولتا جاتا ہے پر خود زہریلا نہیں ہوتا۔

اسے اس دن وہاں کھڑے کھڑے سعید پر طیش آیا تھا وہ سامنے ہوتا تو وہ اس کی مونچھیں کھینچ کر اتار دیتی۔ اس کے بال اتار دیتی اس کے ٹوٹے ٹوٹے کر دیتی۔ اسے پیار کی ایک نگاہ تک نہیں آتی تھی اور وہ کس پر مرمٹی تھی۔

اس کے دل نے سو تاویلیں سو بہانے ڈالے تھے پر بتول کے دل سے مراد نہیں نکل رہا تھا۔ موتیا والا مراد۔

☆☆☆

''تجھے تو بخار ہو رہا ہے مراد!'' کھانے کی میز پر تاجور نے مراد کا ماتھا چھو کر کہا تھا۔ وہ ان دونوں کے ساتھ کھانے کھانا کھانے بیٹھا تھا اور بار بار چھینک رہا تھا۔ تاجور کو اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ لگیں۔ اس نے ماتھا چھوا اور یک دم فکر مند ہو گئی اس کا ماتھا گرم تھا۔

''امی آپ خوامخواہ ہی پریشان ہو رہی ہیں۔ کچھ نہیں ہوا' ابھی یہ آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا شان دار کھانا کھا رہا ہوں تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

مراد نے جیسے ہر بات مذاق میں اڑانے کی کوشش کی تھی۔ پر تاجور کو کب قرار تھا۔ ''مجھے پہلے ہی ڈر تھا بھیگا ہے تو بخار تو ہوا ہی ہوا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا آج تک مراد! تو بارش میں بھیگا ہو اور تجھے بخار نہ ہوا ہو۔''

تاجور کے کہنے پر اس نے اطمینان سے کہا۔

''امی! لندن میں ہر وقت بھیگتا ہی رہتا ہوں اور کچھ نہیں ہوتا مجھے یہ تو میں شاید سفر کر کے آیا ہوں اس لیے ہو گیا ورنہ ٹھیک ہوں میں۔'' مراد نے ماں کی بات کو بالکل سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔

''میری ہی غلطی تھی وقت پر چلا جاتا تو تجھے تکلیف نہ ہوتی تو آرام سے آتا۔'' چوہدری شجاع پچھتایا تھا۔

''میں تو بڑے مزے سے آیا ہوں ابو آپ خوامخواہ میں پچھتا رہے ہیں۔'' مراد نے جیسے باپ کو تسلی دی تھی۔

''بس اب دل نہیں لگتا تمہارے بغیر مراد اتنے سال سے تمہاری جدائی برداشت کر رہی ہوں۔ پہلے ایچی سن میں اور اب لندن میں'' تاجور کا دل بھر آیا تھا۔

''تو یہ ضد کس کی تھی۔''

ایچی سن میں پڑھانے کی ورنہ میں تو نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا ہمیشہ۔'' چوہدری شجاع نے لقمہ دیا۔

''ہاں میری ہی ضد تھی اور دیکھیں تا کیسا قابل نکلا ہے۔ یہاں گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تو کیا بنتا۔''

تاجور نے فوراً سے پہلے کہا۔ مراد دونوں کی نوک جھونک سنتے مسکراتے ہوئے کھانا کھاتا رہا اور بالکل ٹھیک نظر آنے کی اداکاری کرتا رہا لیکن اُسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں تھا اُس کی طبیعت واقعی خراب ہو رہی تھی۔

''میں نے تو سوچ لیا ہے مراد! اس بار تمہاری شادی کر کے ہی تمہیں واپس لندن بھیجوں گی۔''

تاجور نے یک دم کہا۔ وہ چونکا اور مسکرایا اور پھر اُس نے کہا۔

''شادی کی بات کریں گی تو پھر تو واقعی طبیعت خراب ہو جائے گی میری' اتنا سکون اور آرام ہے میری زندگی میں آپ کیوں ختم کرنا چاہتی ہیں۔''

تاجور اُس کی بات پر ناراض ہوئی۔

''خوامخواہ میں۔ اکلوتے بیٹے ہو ہمارے' میرا بس چلتا تو تمہاری شادی کر کے ہی آگے پڑھنے کے لیے لندن بھیجتی تمہیں لیکن بس تمہارے ابا نہیں مانے۔''

تاجور نے خفا سے انداز میں چوہدری شجاع کو دیکھا۔

''اور ابا اسی لیے تو اچھے لگتے ہیں مجھے۔ اب بس اور نہیں کھاؤں گا میں۔ تھوڑی دیر لیٹوں گا۔''

مراد کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اُس کے لیے اب واقعی کچھ کھانا مشکل ہو رہا تھا مگر وہ ماں باپ کو پریشان بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تاجور اُس کے جانے کے بعد بھی دروازے کو دیکھتی رہی اور پھر وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''تمہیں کیا ہوا تم تو کھاؤ۔'' چوہدری شجاع نے اُسے روکا۔

''میں اسے دیکھ کر آتی ہوں، سر دبا دیتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔ آپ بکرے کا صدقہ دیں جلدی۔''

وہ کہتے ہوئے مراد کے پیچھے لپکی تھی۔

☆☆☆

بھلیے لوکے! تجھے نیند کیوں نہیں آ رہی؟''

گاموں نے اُس رات اللہ وسائی کو کروٹیں لیتے دیکھ کر کہا تھا۔ بارش کی وجہ سے وہ اس رات کمرے میں سونے کے لیے لیٹے تھے۔

''میں سوچتی ہوں گاموں! پیر صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ موتیا کے رشتے کی دعا کروانے۔'' گاموں اللہ وسائی کی بات پر یک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''آدھی رات کو تجھے موتیا کا رشتہ کیوں یاد آ گیا؟''

اللہ وسائی بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی کچھ دیر کے لیے وہ چپ بیٹھی ہی رہی پھر اُس نے جیسے سب کچھ صاف صاف بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

''خواب دیکھتی ہے وہ!

''خواب؟'' گاموں اُلجھا؟

''چوہدری مراد کو دیکھتی ہے وہ خواب میں''

گاموں سانس نہیں لے سکا۔ ''چوہدری مراد۔''

''کئی سالوں سے دیکھ رہی ہے مجھے کہتی تھی خوابوں میں کوئی نظر آتا ہے۔ میں ہنس کے ٹال دیتی تھی اور کہتی تھی کہ تیری عمر میں سب کو ہی خوابوں میں ایسے سوہنے منڈے نظر آتے ہیں یہ کون سی خاص بات ہے۔ پر وہ ناراض ہو کر کہتی تھی کہ ایسی بات نہیں ہے۔ اور آج تو نے چوہدری مراد کو حویلی چھوڑا ہے تو موتیا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ وہی لڑکا ہے جسے وہ اتنے سالوں سے خوابوں میں دیکھ رہی تھی۔''

اللہ وسائی بتاتی چلی گئی تھی۔ گاموں چپ چاپ گنگ بیٹھا اُس کو دیکھ رہا تھا۔

وہ چپ ہوئی تب بھی گاموں کوئی جواب نہیں دیا پھر لمبی خاموشی کے بعد اُس نے اللہ وسائی سے کہا۔

''جھوٹ تو کبھی نہیں بولا موتیا نے۔''

''ہاں پر اللہ کرے یہ جھوٹ ہی ہو۔'' اللہ وسائی نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''تجھے یاد ہے نا جب اسکول میں پڑھانے کے لیے موتیا کو لے کر گئے تھے تو چوہدرائن نے کتنا ذلیل کیا تھا مجھے کہ تیری جرات کیسے ہوئی کہ تو اُس اسکول میں موتیا کو بھیج رہی ہے جہاں میرا بیٹا پڑھے گا اور میری بیٹی نے میرے بیٹے کو زمین پر بٹھا دیا۔ وہ کوئی کمی کمین تھا۔ تو اوقات بھول گئی ہے؟'' اللہ وسائی کو تاجور کا ایک ایک جملہ یاد تھا۔

''ہاں اور پھر ہم نے اگلے دن موتیا کو ساتھ والے گاؤں کے اسکول میں داخل کروا دیا تھا جہاں روز پانچ میل پیدل چل کر اُس کو چھوڑنے اور لانے کے لیے جاتے تھے۔'' گاموں کو یاد آیا وہ کس طرح موتیا کو کندھو پر بٹھا کر لے کر جاتا تھا اور اللہ وسائی موتیا کا بستہ اٹھائے ساتھ ہوئی تھی۔

''ہاں اور اگلے دن اسکول کی چھت گر گئی تھی چوہدری مراد پر..... اُس کی قسمت تھی کہ وہ زخمی ہوا پر بچ گیا۔'' اللہ وسائی کو پتا نہیں کیا یاد آیا۔ ''ہاں شکر ہے اللہ میرے رب سوہنے کا چوہدریوں کی نسل کو کچھ نہیں ہوا۔ نہ ہی کسی اور بچے کو۔'' گاموں کو خیال آیا۔ اور پھر چوہدری شجاع نے مجھے بلا کے معافی مانگی تھی دانوں کی بوری دی تھی اور کہا تھا کہ میں موتیا کو واپس لے آؤں۔''

''اور میں نہیں مانی تھی۔'' اللہ وسائی نے یاد دلایا

''ہاں تو تو ہے ہی شروع سے ضد کی۔'' گاموں ہنس پڑا تھا۔ ''پر اُس کے بعد چوہدرائن نے تجھے جھڑکنا کم کر دیا تھا۔''

''ہاں پر وہ آج بھی تھمتی اور کمی کمین ہی کہتی ہے مجھے'' اللہ وسائی جیسے یاد دلایا۔

''کمی کمین تو ہیں نا ہم۔ اس کا کیا غصہ کرنا دانے والا نہیں بنایا پانی والا بنایا رب سوہنے نے۔ یہ تو اُس کی تقسیم ہے' گاموں اب بھی مطمئن تھا۔

''رب تقسیم نہیں کرتا جوڑتا ہے پہچان کرواتا ہے۔ پر گاموں! میں نہیں چاہتی میں چوہدرائن سے دوبارہ کچھ سنوں۔''

اللہ وسائی نے کہا اس سے پہلے کہ گاموں کچھ کہتا۔ باہر دروازے کو کسی نے زور سے بجایا تھا۔ وہ دونوں چونک گئے۔

''یہ اتنی رات کو کون آ گیا۔ ذرا دیکھوں میں۔'' گاموں کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اللہ وسائی بھی اُس کے پیچھے تھی۔

''وہ چوہدری صاحب کے بیٹے کو بہت بخار ہے انہوں نے تمہاری بیٹی کو بلوانے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ ڈاکٹر ہے کوئی دوا دارو

کر دے۔''

دروازہ کھلتے ہی گامو نے باہر ایک ٹانگے کے ساتھ چوہدری کے دو ملازم دیکھے تھے۔ پھر ایک لفظ کہے بغیر گامو اندر پلٹا تھا مگر اُسے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہاں پیچھے اللہ وسائی کے ساتھ موتیا کھڑی تھی وہ بھی شاید رات گئے بجنے والے دروازے کی وجہ سے جاننے آئی تھی۔

''میں فرسٹ ایڈ باکس لے لوں ابا۔'' موتیا نے گامو کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا تھا اور اندر چلی گئی تھی۔ اللہ وسائی اور گامو نے عجیب نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر گامو نے ہاتھ اُٹھا کر مدہم آواز میں کہا۔

''جو رب سوہنے کی مرضی''

☆☆☆

تاجور کے وہم وگمان میں بھی کبھی یہ نہیں تھا اسے زندگی میں کبھی گامو ماشکی اور اُس کی بیٹی سے بھی مدد مانگنی پڑ سکتی تھی۔ مگر اُس رات پڑ گئی تھی۔ مراد کو چڑھنے والا بخار بڑھتا ہی گیا تھا اور آدھی رات تک وہ اس طرح بے سدھ اور بے حال ہو گیا تھا کہ تاجور نے رونا شروع کر دیا تھا۔ گاؤں کی ڈسپنسری میں کمپاؤنڈر بیٹھتا تھا اور وہ دو دفعہ مراد کو دیکھ کر جا چکا تھا مگر اُس کی کسی دوائی کسی ٹوٹکے سے مراد کو افاقہ نہیں ہوا تھا اور بالآخر یہ اُسی کا مشورہ تھا کہ موتیا کو بلا کے مریض دکھایا جائے۔

''اُس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے چوہدری جی! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے ابھی ڈاکٹر نہیں بنی پھر بھی بڑا تجربہ ہے اُسے مریضوں کا۔''

بوڑھے کمپاؤنڈر کو اس وقت اس مسئلے کا حل موتیا ہی نظر آئی تھی اور چوہدری شجاع نے تاجور کو بتا کر موتیا کو بُلا بھیجا تھا۔ تاجور نے بلا چون چرا اُن کی بات مانی تھی اُسے اس وقت بس اپنے بیٹے کی زندگی اور صحت چاہیے تھی' اُس کا وسیلہ کوئی بھی بنتا اُسے پرواہ نہیں تھی۔

وہ پہلا موقع تھا جب تاجور نے جوان موتیا کو دیکھا تھا اُس نے موتیا کو جس کے حسن کے قصے پورے گاؤں میں مشہور تھے۔ وہ کالی چادر اوڑھ کے آئی تھی اور اُس کالی چادر میں بدلی میں چھپا چاند لگ رہی تھی۔

تاجور کو اُسے دیکھ کر عجیب وہم پڑے۔ مراد کے سامنے جائے گی۔ وہ اُسے دیکھے گا تو کہیں دیکھتا نہ رہ جائے۔ مرد ذات ہے اور وہ خوب صورت ہے۔ تاجور اُس کے سلام کے جواب میں سوچنے بیٹھ گئی تھی اور موتیا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ مریض کیوں نہیں

دکھا رہے۔ بالآخر تاجور نے جیسے ہار مانتے ہوئے اُسے مراد کے کمرے میں چلنے کا کہا تھا۔ اُس نے اپنے دل کو تسلی دے لی تھی کہ وہ بخار میں سدھ بدھ کھویا بیٹھا ہے اس حالت میں اُسے کہاں ہوش تھا۔ موتیا کے حسن کا۔

موتیا چوہدری شجاع اور تاجور کے ساتھ مراد کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ لمبا تڑنگا مرد جسے آج دوپہر کو اُس نے اپنے خوابوں سے نکل کر حقیقت میں دیکھا تھا اتنی جلدی دوبارہ اُسے اس حال میں ملے گا۔ موتیا نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اور نہ صرف ملے گا بلکہ وہ اُسے چھو بھی سکے گی اور وہ بھی اُس کے اتنے قریب بیٹھ کر۔

موتیا کے لیے وہ معجزہ تھا جو اُس کی دعا کے بدلے ہوا تھا۔ مراد آنکھیں بند کیے ہوئے پڑا تھا۔ نہ کمرے میں ہونے والی آوازوں پر اُس نے آنکھیں کھولی تھیں نہ ہی اپنا ماتھا چھونے پر، نہ اپنی کلائی پکڑنے پر۔

موتیا نے زندگی میں پتا نہیں کتنے مریضوں کو چھوا تھا۔ پر وہ اب جس کی کلائی تھام رہی تھی وہ اُس کے لیے مریض نہیں تھا۔ اُس کے ہاتھ کانپنا شروع ہو گئے تھے۔ مراد کی گرم کلائی کو اُس کے ماں باپ کے سامنے تھام کر بیٹھے رہنا آسان نہیں تھا۔

اپنی گھڑی کو دیکھ کر اُس کی نبض لیتے ہوئے اور پھر اس کا ٹمپریچر لیتے ہوئے موتیا نے مراد کے چہرے کو دیکھنے کوشش نہیں کی تھی وہ بار بار اپنے ذہن کو یہ سمجھا رہی تھی کہ وہ بس ایک مریض تھا اور وہ اس کا علاج کرنے آئی تھی اُسے اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچنا تھا مگر یہی سب سے مشکل بن گیا تھا۔

''پتر ٹھیک ہے نا میرا بیٹا۔۔ بخار کہیں دماغ کو تو نہیں چڑھ گیا۔ چوہدری شجاع نے عجیب بے قراری سے اُسے مخاطب کیا تھا۔ وہ اس وقت اپنا فرسٹ ایڈ کا باکس اٹھائے مراد کے لیے ایک انجکشن تیار کر رہی تھی۔

''جی بالکل ٹھیک ہیں یہ اور بخار سر وغیرہ کو نہیں چڑھا لیکن تیز بخار ہے۔ ابھی میں انجکشن لگاؤں گی چند گھنٹوں میں ٹھیک ہو جائیں گے۔'' موتیا نے اُسے تسلی دی تھی اور پھر مراد کے بازو میں سوئی گھسا دی تھی۔ اور اُس لمحے پہلی بار مراد کے جسم میں جنبش ہوئی تھی اُن نے آنکھیں کھول کر ان سب کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا لیکن بخار واقعی اتنا تیز تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکا۔ اُس نے موتیا کو دیکھا تھا پر وہ اسے یاد نہیں رکھ سکا اور اُس سے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اس کے کانوں میں کسی کی آواز گونجی تھی کسی کی میٹھی مہربان آواز' مراد کی سماعتوں نے جیسے اس آواز کو شناخت کرنے کی کوشش کی تھی اور آواز شناخت نہیں ہوئی تھی پر لاشعور کا قصہ بن گئی تھی۔

فرسٹ ایڈ باکس بند کر کے موتیا اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اٹھ کے کھڑے ہوتے ہی تاجور کی سرد مہر نظریں تھیں جن کا سامنا

اُسے ہوا تھا۔ وہ تاجور کی آنکھوں کی خفگی کو سمجھ نہیں پائی یقیناً وہ اس کے لیے نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو اُن کے بیٹے کا علاج کرنے آئی تھی اُس کے ساتھ ان کی کیا خفگی ہو سکتی تھی۔ اُس نے اپنے اس احساس کو وہم سمجھ کر جھٹکا تھا۔

''تمہارا بہت شکریہ بیٹا۔ تم رات کے اس پہر مراد کی مدد کے لیے آئیں۔'' شجاع نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر جیسے اپنی ممنونیت کا اظہار کیا تھا۔

''میں تو ڈاکٹر بن رہی ہوں۔ ڈاکٹر کے لیے رات دن کچھ نہیں ہوتا بس مریض ٹھیک ہونا چاہیے اور یہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے ان شاء اللہ اُس نے جیسے انہیں یقین دلایا تھا۔

تاجور نے اُس سے کوئی بات نہیں کی تھی موتیا باہر آ گئی جہاں برآمدے میں گامو ماشکی بیٹھا ہوا تھا۔ چوہدری شجاع نے ایک بار پھر گامو سے ہاتھ ملاتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور جیسے گامو نہال ہو گیا۔ ایسا موقع زندگی میں کہاں روز روز ملتا ہے کہ وہ بھی کسی کے احسانوں کے بدلے میں احسان کر سکے اور یہ سب موتیا کے طفیل ہوا تھا۔

دونوں باپ بیٹی چوہدریوں کے تانگے میں رات گئے اسی خاموشی کے ساتھ واپس آ گئے تھے جس خاموشی سے گئے تھے اور موتیا کے جانے کے گھنٹہ بعد مراد کا بخار اترنا شروع ہو گیا تھا۔ تاجور کے دل کو عجیب قرار آیا تھا۔

''اُس بچی کے ہاتھ میں واقعی ہی شفا ہے ماشاء اللہ۔'' چوہدری شجاع نے تاجور سے کہا تھا وہ جیسے اور احسان مند ہوا تھا۔ تاجور کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔ اُسے بس ایک ہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہیں مراد نے بخار میں بھی اُس کو دیکھ نہ لیا ہو۔

کہتے ہیں ماؤں کے سارے اندیشے صحیح ہوتے ہیں۔ تاجور کو پتا ہی نہیں تھا مراد اُسے پہلے ہی دیکھ کر فدا ہو چکا تھا جس کی ایک جھلک سے بھی بچانے کے لیے تاجور بے حال ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اپنے گھر میں وہ رات موتیا نے جائے نماز پر گزاری تھی وہ اُسے تکلیف میں دیکھ تو آئی تھی مگر وہ تکلیف اب اُس پر بہت بھاری پڑ رہی تھی۔ پتا نہیں وہ اُس کے دل میں کہاں جا بیٹھا تھا کہ دل اُس کے خیال بنا دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ حاصل اور حصول تک کا تو تب تک موتیا نے سوچا ہی نہیں تھا۔ نہ دیواروں کا سوچا تھا نہ اپنی اوقات کا۔ اُس کو تو بس پیار ہوا تھا اور پیار بھی فی سبیل اللہ، جس میں پڑ کے محبوب سے زیادہ رب یاد آنا شروع ہو جاتا ہے۔

اللہ وسائی نے صبح سویرے موتیا کو جائے نماز پر ہی سویا پایا۔ اُس نے موتیا کو جگانے کے لیے اُس کا ماتھا چھوا تھا۔ اُس کا ماتھا

بری طرح جھلس رہا تھا۔ وہ مراد کی بیماری اپنے سر اور گھر لے آئی تھی۔ سرخ چہرے کے ساتھ بخار میں سدھ بدھ کھوئے وہ جائے نماز پر پڑی تھی اور اللہ وسائی اُس کا چہرہ بس دیکھتی جا رہی تھی۔ اُس نے عشق کا چہرہ پہلی بار دیکھا تھا اور ایسا طوفانی عشق جو ایک دن ایک رات میں ہوا تھا وہ اُس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رکھ کے روتے ہوئے موتیا کے لیے دعا کر رہی تھی۔ وہ مرادیں پوری کرنے والا رب اس کی بیٹی کی مراد پوری کر دے۔ موتیا جو دل سے مانگ رہی تھی۔ اس کی ماں اپنی توتلی زبان میں مانگ رہی تھی روتے اور گڑگڑاتے ہوئے اس کے بس میں بس یہی تھا۔

☆☆☆

''تو کتنا جھلا ہے گامو...... کل سارا دن اور ساری رات تو بارش برستی رہی ہے۔ گاؤں کی گلیاں بھی گیلی ہیں اور تو پھر مشک بھر کے چل پڑا ہے۔''

صبح سویرے گاؤں میں کسی نے گامو کو کنویں پر کھڑے دیکھا تھا اور ہنس کے کہا تھا۔

''لو بھلا گلیاں گیلی ہیں نا۔ گھڑے تو خالی ہیں نا گاؤں والوں کے' وہ کون سی بارش بھرے گی۔ وہ گامو کی مشک کا ہی انتظار کرتے ہیں۔'' گامو نے کہا تھا اور ہمیشہ کی طرح مشک بھر کے سب سے پہلے حویلی کی طرف چل پڑا تھا۔

اس دن حویلی میں اس کا سامنا صبح سویرے برآمدے میں پھرتے ہوئے مراد سے ہو گیا تھا اور گامو اسے بھلا چنگا دیکھ کے حیران ہونے سے زیادہ خوش ہوا تھا۔

''آپ تو بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں چھوٹے چوہدری جی اللہ کی مہربانی سے' گامو نے سلام دعا کے بعد کہا۔ مراد کچھ حیران ہوا۔

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں بیمار تھا؟'' گامو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ وہاں اپنے موتیا کے ساتھ رات آنے کا ذکر کرے یا نہ کرے۔ اگر مراد کو اس کا آنا یاد نہیں تھا تو شاید ذکر نہ کرنا ہی بہتر تھا گامو نے سوچا تھا۔

''میں نے ادھر کنویں پر گاؤں کے کسی ملازم سے سنا ہے۔'' گامو نے جیسے ٹالتے ہوئے کہا تھا اور حویلی کے باورچی خانے میں پانی ڈالنے چلا گیا وہ جب پانی بھر کے واپس آیا تو بھی مراد وہیں بیٹھا ہوا تھا۔

''گامو چاچا کل ٹانگے میں دو لڑکیاں تھیں وہ کون تھیں؟'' مشک کا منہ بند کرتے ہوئے گامو ٹھٹکا تھا اندر سے آتی تاجور وہیں رک گئی تھی اس نے مراد کا سوال سن لیا تھا اور اس کے جیسے دل کو ہاتھ پڑا تھا۔ وہ گامو کا جواب سننا چاہتی تھی اور اس کا دل کہہ رہا تھا ایک موتیا تھی۔

''پتا نہیں میں نے دھیان نہیں کیا جی.....آپ کے ساتھ آگے بیٹھا ہوا تھا پیچھے والوں پر غور نہیں کیا میں نے'' گاموں نے جھوٹ بولنے میں اپنی عزت جانی تھی۔ وہ اپنے منہ سے اپنی بیٹی کا پتا کیسے بتاتا۔ پر وہ حیران تھا مراد کو اس کی بیٹی یاد نہیں وہ تو رات کو اس کا علاج کرنے آئی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' مراد نے مزید نہیں کریدا اور گاموں کو جانے دیا۔ اسے یقین تھا گاموں جھوٹ بول رہا تھا مگر وہ گاموں کے جھوٹ کا پردہ رکھنا چاہتا تھا۔ گاموں مزید کچھ کہے بغیر سلام کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔

تب ہی تاجور باہر آ گئی تھی۔ ''تم کیوں صبح سویرے باہر نکل کے بیٹھ گئے ہو؟'' اس نے آتے ہی مراد کو ڈانٹا تھا۔

''ہاں بس نیند نہیں آ رہی تھی مجھے اور بخار اترا ہے تو کمرے میں عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی اس لیے باہر آ کر بیٹھ گیا۔''

مراد نے مسکراتے ہوئے ماں سے کہا جس نے پاس آتے ہی اس کی کلائی اور ماتھا چھو کر جیسے اس کے ٹھیک ہونے کی تصدیق کی تھی اور جیسے مطمئن ہوئی۔

''تم گاموں سے کن لڑکیوں کا پوچھ رہے تھے؟'' اس کے اگلے سوال پر مراد بری طرح سے گڑبڑایا۔

''اوہ اچھا ہاں وہ ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ ٹانگے میں دو تین لڑکیاں تھیں تو میں نے سوچا ان کے بارے میں پوچھوں آخر میرے ہی گاؤں کی ہیں۔'' مراد کے پاس کوئی مضبوط وجہ نہیں تھی اور اس کی گفتگو میں یہ بات بری طرح نظر آئی تھی۔

''ایک لڑکی گوری چٹی، لمبے بالوں والی ہوگی۔ موٹی موٹی کالی آنکھیں تیکھی ناک۔'' مراد نے حیرانی سے ماں کو دیکھا پھر ہنسا۔ ''آپ تو وہاں تھیں ہی نہیں آپ کو کیسے پتا وہ کیسی دکھتی ہوں گی؟''

''کیا کوئی ایسی تھی؟ مراد نے ماں کو ٹالا پتا نہیں امی میں نے اتنا غور سے تھوڑی دیکھا تھا ان کو میں تو ویسے ہی پوچھ لیا تھا گاموں چاچا سے اچھا یہ بتائیں نانا جان کی طرف کب چلنا ہے؟''

اس نے کہتے ہوئے ساتھ ہی بات بدل دی تھی۔ وہ ماں کے سوالوں سے زیادہ انداز پر پریشان ہوا تھا۔

☆☆☆

''بتول موتیا کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ''مجھے ایسے مت دیکھ بتول جھوٹ نہیں بول رہی میں! جو دیکھا ہے وہی بتا رہی ہوں 'میں نے پہلے بھی سانپ دیکھا تھا اب پھر دیکھا ہے۔'' موتیا کو اس کے چہرے سے پتا چل گیا تھا کہ وہ اس کی بات پر الجھ رہی تھی۔ مراد کو آئے تیسرا دن تھا جب وہ دونوں ملی تھیں۔ کیونکہ بتول کو اس کی طبیعت خراب ہونے کا پتا چلا تھا اور وہ عیادت کے لیے آئی

تھی۔

''تو نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ تیرے علاج سے بخار اترا ہے مراد کا۔'' بتول نے جواباً جیسے لڑتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

''تجھ سے ملاقات ہوتی تو بتاتی نا اب آ گئی تو بتا دیا۔'' موتیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بتایا ہے؟'' مجھے اماں نے بتایا ہے ۔بتول نے کٹ کھنے انداز میں کہا۔

''اچھا چل جس نے بھی بتایا ہو مراد ٹھیک ہو گیا یہ ضروری تھا' کون ٹھیک کرتا یہ تھوڑی ضروری تھا۔''

موتیا نے صلح جو انداز میں کیا اور وہ ہمیشہ یہی کرتی تھی بتول کے سامنے بتول کو غصہ آتا موتیا پانی ڈال کر ٹھنڈا کر دیتی۔

''مراد پوچھ رہا تھا گاموں چاچا سے کہ ٹانگے پر اس دن کون سی لڑکیاں تھیں۔'' بتول نے یک دم اس سے کہا۔ موتیا نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

''اچھا.....ابا نے بتا دیا اسے؟''

''نہیں چاچا نے کہا کہ انہوں نے دھیان ہی نہیں دیا ایک تو گاموں چاچا بھی بڑا ہی بھولا ہے۔ یہ تو چوہدرائن نے میری اماں سے پوچھا تو اسے پتا چلا کہ تو اور میں تھے تانگے میں۔'' بتول بتاتی جا رہی تھی۔

''مجال ہے تم بات کرتے ہوئے ذرا سانس لے۔'' موتیا کو اس کے مشین کی طرح بولنے پر ہنسی آئی تھی۔

''میں تمہیں کیا بتا رہی ہوں اور تم مجھے کیا بتانا شروع ہو گئی ہو۔'' بتول ناراض ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اور دیکھو اب یہ خواب وغیرہ دیکھنا چھوڑ دو اتنا اچھا لگتا ہے تو جا کر سیدھا سیدھا ملو چوہدری مراد سے اور کہو رشتہ بھیجے۔

موتیا بتول کی باتوں پر ہنسنا شروع ہوئی اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آنا شروع ہو گیا۔

''پیار ایسے نہیں ہوتا بتول یہ تو پیار نہیں ضرورت ہو گئی۔'' بتول کو اس کی بات نے لاجواب کیا تھا۔

''تجھے کبھی ضرورت نہیں پڑتی اس کی بس صرف پیار سے ہی کام چل جائے گا تیرا؟'' اس نے کچھ طنزیہ انداز میں جواباً موتیا سے کہا تھا۔

''میرے ہاتھوں کی لکیروں میں ہوا تو بھی میرا ہے نہ ہوا تو بھی موتیا کا ہی مراد رہے گا وہ۔'' اس نے عجیب سے انداز میں بتول کو ہاتھ کی ہتھیلیاں دکھاتے ہوئے کہا تھا اور بتول خاموش رہ گئی تھی۔

☆☆☆

پیرابراہیم نے مراد کا ماتھا چومتے ہوئے اسے گلے لگا کر پتا نہیں کیا کیا پھونکا تھا۔ ''مجھ سے بھی لمبے ہو گئے اب تو تم۔''

انہوں نے مرد کے گال تھپکتے ہوئے کہا تھا۔ مراد ساتھ کھڑی ماں کو دیکھتے ہوئے ہنسا۔

''ہاں مگر امی کو میرا قد کاٹھ نظر نہیں آتا انہیں آج بھی چھوٹا لگتا ہوں میں نانا جان امی کو سمجھائیں۔''

''اچھا اب شکایتوں کے لیے تھوڑی لے کر آئی ہوں۔'' تاجور نے فوراً سے پیشتر کہا۔

تاجور کی بات پر پیرابراہیم اور مراد دونوں ہنس دیئے تھے۔

''میں ذرا ڈیرے کا پھیرا لگا کے آتا ہوں نانا جان! پچھلی بار آیا تھا تو آپ کے ڈیرے پر نہیں گیا۔''

''ملازم کو ساتھ لے جانا۔'' پیرابراہیم نے جواباً کہا۔

''نہیں ملازم کی ضرورت نہیں ہر راستے اور رقبہ کا پتا ہے مجھے۔'' وہ کہتے ہوئے چلا گیا تھا تاجور نے قربان جانے والی نظروں سے بیٹے کو جاتا دیکھا اور پھر پیرابراہیم سے کہا۔

''بابا جان میں نے اس بار ماہ نور سے مراد کا رشتہ طے کر دینا ہے۔'' پیرابراہیم نے اس سے کہا۔

''تم نے مراد سے اس کی مرضی پوچھی؟''

تاجور عجیب تنفر سے ہنسی۔ ''میں ماں ہوں اس کی ابا جان مجھے انکار کیسے کرے گا وہ۔''

''یہ دل کی بات ہوتی ہے اور دل ماں کی مرضی پر نہیں چلتا۔ تم پہلے اس سے پوچھو پھر میں یحییٰ سے بات کروں گا۔''

پیرابراہیم نے دوٹوک انداز میں اسے بتایا تھا۔ تاجور کو باپ کا انداز برا لگا تھا لیکن وہ ادب کے مارے خاموش رہی ماہ نور اس کے بڑے بھائی کی بیٹی تھی اور تاجور پچھلے ایک سال سے مراد کے ساتھ اس کا رشتہ کرنے کے لیے بار بار پر تولتی رہتی تھی اور ہر بار پیر ابراہیم اس سے یہی کہتے کہ وہ مراد سے پوچھے۔

☆☆☆

''پیر صاحب کے باغ کا امرود ہے بھلا اجازت کیسے توڑ لیا تم نے موتیا؟'' گاموموتیا پر خفا ہوا تھا۔ وہ صبح سے چلتے ہوئے کہیں اب جا کر پیر صاحب کے ڈیرے پہنچے تھے اور باغ کی حدود شروع ہوتے ہی موتیا تھک ہار کر بیٹھ گئی تھی گاموا اور اللہ وسائی بھی سانس لینے کے لیے اس کے پاس بیٹھ گئے تھے اور تب ہی موتیا کو درخت پر لٹکے وہ امرود نظر آئے جنہیں اس نے کھڑا ہو کر توڑ لیا تھا اور امرود کے توڑتے ہی اللہ وسائی اور گاموا دونوں بے حد خوف زدہ ہو گئے تھے۔

''اللہ کا رزق ہے کوئی بھی کھا سکتا ہے میں پیر صاحب کو بتا دوں گی۔'' اس نے امرود دوپٹے سے رگڑ کر صاف کرنا شروع کیا تھا۔

''بغیر اجازت کوئی ان کے ڈیرے سے کچھ نہیں لیتا۔'' اللہ وسائی اور ناراض ہو گئی۔

''اب تو لے لیا نا اماں بھوک لگی ہے۔''

اس نے کہتے ہوئے امرود کو دانتوں سے کاٹنا شروع کیا تھا اور بالکل اس وقت اس نے مراد کو دیکھا تھا جس کی نظر اسی پر تھی امرود موتیا کے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ مراد اب ان کی طرف آ رہا تھا اور موتیا ٹکٹکی باندھے آتا دیکھ رہی تھی اور اس کا ہاتھوں سے گرتے امرود کو دیکھ کر گاموا اور اللہ وسائی نے بھی اس طرف دیکھا تھا جہاں وہ دیکھ رہی تھی۔ مراد سفید شلوار قمیص میں ملبوس چمڑے کی کھلی چپل پہنے ہوئے تھا۔ زمین پر اگی دو انچ گھاس میں اس کے پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔

موتیا کو بالکل اسی لمحے وہ خواب یاد آیا تھا وہ بھی ایسی ہی جگہ تھی جہاں اس نے مراد کو دیکھا تھا۔ ایک عجیب سی وحشت اور سراسیمگی میں اس نے زمین پر گھاس کو دیکھنا شروع کیا تھا اور پھر اس نے گھاس میں لہراتی ہوئی وہ چیز دیکھ لی تھی وہ کوبرا سانپ جو مراد کے پاؤں کے قریب رینگ رہا تھا اور کسی بھی لمحے مراد کا پاؤں اس پر ہوتا۔ خوف سے اس کا حلق خشک ہوا تھا۔

موتیا کو خواب والا سانپ یاد آیا تھا۔ اس کی خوف ناک آنکھیں اور وہ جیسے کسی ٹرانس میں اس بل کھاتے ہوئے سانپ کو دیکھتی رہی جو مراد کے چپل سے نظر آنے والے پاؤں کے قریب پہنچنے والا تھا۔

☆☆☆

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)